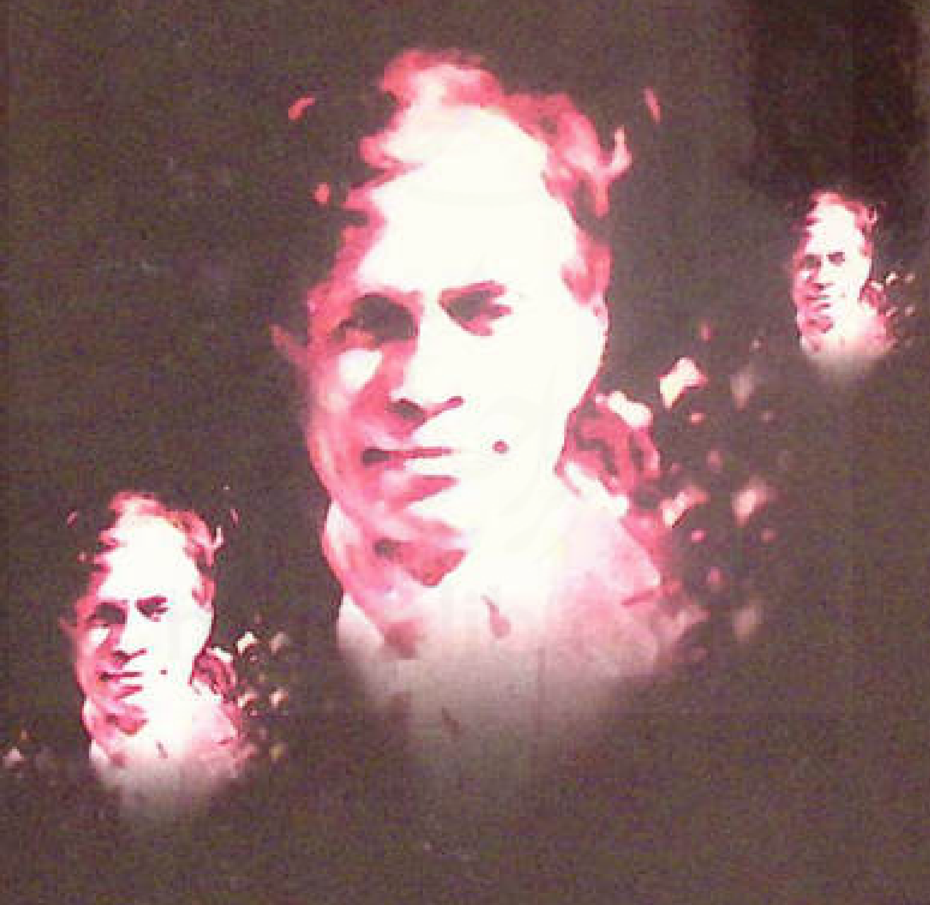
کُلیاتِ باقر

تیشۂ لفظ، جوئے معانی، غیر مدوّن اور غیر مطبوعہ کلام

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

ترتیب و تہذیب: عاصمہ اصغر



کلّیاتِ باقر

(تیشۂ لفظ، جوئے معانی، غیر مطبوعہ اور مطبوعہ غیر مدوّن کلام)

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

ترتیب و تہذیب

عاصمہ اصغر

اظہار سنز

19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150

ہیڈ آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761

E-mail: izharsons_2004@hotmail.com
www.izhar-sons.com

اکتوبر ۲۰۱۰ء

نام کتاب	:	کلیاتِ باقر
نام مصنف	:	ڈاکٹر سجاد باقر رضوی
ترتیب وتہذیب	:	عاصمہ اصغر
ناشر	:	سید محمد علی انجم رضوی
طابع	:	سید اظہار الحسن رضوی
مطبع	:	اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور
سرورق	:	ریاظ
کمپوزنگ	:	تصور کمپوزنگ سنٹر، سید پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور
قیمت	:	۹۵۰ روپے

یکے از مطبوعات

اظہار سنز O ۱۹۔ اردو بازار، لاہور (پاکستان) فون: ۳۷۲۳۰۱۵۰

انتساب

محترمہ قیصر جہاں

اور باقر صاحب کی بہن

محترمہ تہذیب سجاد

کے نام

◆◆

نکلیں گی چٹانوں سے مری فکر کی نہریں
میں لفظ کے تیشے سے انھیں کاٹ رہا ہوں

فہرست

جوئے معانی

غیر مطبوعہ و غیر مدوّن کلام

◆◆◆

کشتِ ہستی تو مجھے پہچان تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں

حرفِ آغاز

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی علمی، ادبی اور تعلیمی حلقوں میں ایک بے حد اہم نام ہے جو اپنی اعلیٰ صفات اور ان گنت خوبیوں کے سبب اپنے چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتا ہے۔ مجھے بھی اِس حلقے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مگر یوں کہ میں نے اپنے دھیان میں باقر صاحب کی ایک تصویر بنا رکھی ہے جس سے میرا مکالمہ جاری رہتا ہے۔ گزشتہ برس میں نے باقر صاحب کے شاگردوں سے رابطہ کر کے اُن کے تاثرات مضامین کی صورت میں جمع کیے اور "خوشبو تیری یادیں" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر دی کہ شاید اِس طرح اس محبت و عقیدت کا حق ادا ہو جائے۔ لیکن باقر صاحب کے وہ شاگرد جو اُن کے قدموں میں بیٹھ کر اکتسابِ ہنر کرتے رہے ہیں، جانتے ہیں کہ باقر صاحب کے احسانات کا بدلہ اُتارنا کہاں ممکن ہے؟

میری خواہش تھی کہ باقر صاحب کے حوالے سے کوئی ایسا کام ہو جائے جس کی ضرورت بھی ہو اور اس کی اہمیت و افادیت بھی مسلمہ ہو۔ سو اِس پہلو سے باقر صاحب کی شاعری سے بہتر کام کیا ہو سکتا تھا۔ اِس کتاب کی ترتیب و تہذیب میں کیسے کیسے مرحلے آئے۔ کون کون لوگ ان ہمت شکن مراحل میں میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا جزوی تذکرہ آگے چل کر ہو گا۔ سرِ دست اِس کلیات کے بارے میں چند باتیں پیش ہیں۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے پہلے مجموعۂ کلام "تیشۂ لفظ" کی اوّلین اشاعت مارچ ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ اس کے ناشر ولید میر تھے اور اِسے کتابیات لاہور نے سید اظہار الحسن رضوی کے زیرِ نگرانی مطبع عالیہ، ٹمپل روڈ، لاہور سے شایع کیا۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعۂ کلام کو خطِ نسخ کے ٹائپ میں شایع کیا گیا ہے۔ کاغذ دبیز اور عمدہ استعمال ہوا ہے۔ "تیشۂ لفظ" کا دیباچہ ناصر کاظمی نے "شہرِ فرہاد" کے عنوان سے تحریر کیا ہے جب کہ فلیپ پر حسن عابدی اور سہیل احمد خان کی آرا درج ہیں۔ انتساب مجتبیٰ حسین اور قیصر کے نام ہے۔ "تیشۂ لفظ" کی دوسری اشاعت دسمبر ۱۹۹۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اِسے ملک لاء چیمبر، راول پنڈی کی طرف سے شایع کیا گیا۔ اس اشاعت میں بھی ناصر کاظمی کی تحریر موجود ہے۔ البتہ "دیباچہ" کے عنوان کے تحت باقر صاحب کی دو صفحات پر مشتمل تحریر کا اضافہ کیا گیا ہے جس پر ۳۱ مئی ۱۹۸۹ء کی تاریخ درج ہے۔ اسی طرح سجاد باقر رضوی کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا لاحقہ بھی موجود ہے۔ "تیشۂ لفظ" کے پہلے ایڈیشن میں غزلوں کی تعداد ۶۲ ہے جب کہ دوسرے ایڈیشن میں ایک غزل کے اضافے سے تعداد ۶۳ ہو گئی ہے۔ دوسرا ایڈیشن کتابت شدہ ہے جس میں کاتب نے بعض لفظوں کے املا میں تصرّف کیا ہے مثلاً باقر صاحب "چاہیے"، "لیے"، "کیے"، "دیے" وغیرہ الفاظ میں ہمزہ استعمال نہیں کرتے۔ دوسرے ایڈیشن کے کاتب نے ایسے تمام الفاظ کو ہمزہ کے ساتھ کتابت کیا ہے اور کتاب چھاپنے والوں نے اس غلطی کو درست نہیں کیا۔ اسی طرح "انھوں"، "انھیں"، "جنھیں" وغیرہ الفاظ کو باقر صاحب نے ہائے دوچشمی کے ساتھ لکھا ہے لیکن دوسرے ایڈیشن میں ان الفاظ کو انہوں، انہیں، جنہیں بنا دیا گیا ہے۔ ایک غلطی جو دونوں ایڈیشنوں میں موجود ہے وہ لفظ "گزر" کا املا ہے۔ یہ لفظ اور اِس کے متعلقات غزلوں میں جہاں بھی استعمال ہوئے ہیں انھیں "ذ" کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

ایسے الفاظ کو بہ تکرار ''ذ'' کے ساتھ لکھنا اِس شک میں ڈالتا ہے کہ شاید باقر صاحب اس صورت کو جائز خیال کرتے تھے۔ لیکن اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام ''جوئے معانی'' میں ایسے الفاظ کو ''ذ'' اور ''ز'' کے ساتھ دونوں صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ چناں چہ معلوم ہوتا ہے کہ ''تیشۂ لفظ'' کے دونوں ایڈیشنوں میں یہ غلطی ہوئی ہے اور ''جوئے معانی'' میں بھی جزوی طور پر یہ غلطی دہرائی گئی ہے۔ زیرِ نظر کلیات میں جہاں جہاں ایسے الفاظ آئے ہیں، ان کا املا درست کر دیا گیا ہے۔ ''تیشۂ لفظ'' کے دوسرے ایڈیشن میں پروف کی کافی اغلاط موجود ہیں۔ مجھے بیگم سجاد باقر رضوی سے معلوم ہوا کہ باقر صاحب کے ایک شاگرد نے (جن کا ذکر دیباچے میں کیا گیا ہے) باقر صاحب کی خوشنودی کے لیے اپنے خرچ پر یہ ایڈیشن شایع کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن باقر صاحب ''تیشۂ لفظ'' کی اِس صورت سے زیادہ خوش نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے شاگرد سے تو کچھ نہ کہا البتہ مارکیٹ کو کتاب کی ترسیل روک دی۔ (یہ کتاب اب بھی کافی تعداد میں بیگم باقر کے پاس موجود ہے)۔ بہرحال ''کلّیاتِ باقر'' کی تدوین میں ''تیشۂ لفظ'' کے پہلے ایڈیشن ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے اور پروف و املا کی چند ایک معمولی غلطیوں کو درست کر دیا گیا ہے۔

کلّیات میں شامل ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ''جوئے معانی'' ۱۹۹۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ مکتبہ تمثیل کے زیرِ اہتمام طفیل آرٹ پریس لاہور سے شایع ہوا۔ ۱۳۳ صفحات پر مشتمل اس مجموعۂ کلام کو کتابت کروایا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ نگار جدید لہجے کے معروف شاعر محمد خالد ہیں جنھیں باقر صاحب کا شاگرد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ کتاب کی فہرست کے آخر میں ایک الگ کاغذ چسپاں کر کے چھ غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کتاب میں شامل یہ غزلیں فہرست میں درج ہونے سے رہ گئی تھیں اور انھیں بعد از طباعت چھاپ کر فہرست کے اختتام پر لگا دیا گیا

لیکن اس کے پس منظر میں ایک دل چسپ واقعہ ہے جسے محمد خالد نے اپنے مضمون ''باقر صاحب۔ کچھ یادیں'' میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جوئے معانی چھپ گئی لیکن مسودے میں شامل پانچ چھ غزلیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ باقر صاحب بہت ناراض ہوئے۔ کتاب کے ناشرین (آفتاب اور ضیا) نے کہا کہ کوئی بات نہیں یہ غزلیں آیندہ آنے والے مجموعے میں شامل ہو جائیں گی لیکن باقر صاحب کا کہنا تھا کہ اس کتاب میں وہ غزل شامل نہیں ہے جس کے ایک شعر پر دیباچے کا اختتام ہوتا ہے اور جب لوگ اس شعر کو کتاب میں تلاش کریں گے اور انھیں یہ شعر نہیں ملے گا تو کیا ہوگا۔ بہر حال یہ غزل اور اس کے ساتھ چار پانچ مزید غزلیں الگ سے طبع کروا کر کتاب کی دوبارہ جلد بندی کروائی گئی۔''
>
> (خوشبو تیری یادیں، ص ۵۲)

''جوئے معانی'' میں غزلوں کی تعداد ۶۳ ہے۔ یوں باقر صاحب کی زندگی میں شایع ہونے والے دونوں مجموعہ ہائے کلام میں غزلوں کی کل تعداد ۱۲۶ بنتی ہے۔ یہ غزلیں باقر صاحب کی اپنی منتخب کی ہوئی ہیں اور انھیں مسودے کی صورت میں انھوں نے اپنے قلم سے تحریر کیا۔ باقر صاحب کا یہ طریق تھا کہ غزل لکھنے کے بعد آخر میں تاریخ کا اندراج ضرور کرتے تھے۔ ''تیشہ لفظ'' کے دونوں ایڈیشنوں میں اس امر کا اہتمام موجود ہے۔ البتہ دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اضافہ شدہ غزل کے نیچے تاریخ درج نہیں۔ اسی طرح ''جوئے معانی'' کی تمام غزلوں کو کتابت کرواتے ہوئے تواریخ اور سنین کو حذف کر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں تاریخ اور سن درج کرنے سے شاعر کے شعری سفر کے ارتقا کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور شاید باقر صاحب کا بھی یہی منشا تھا لیکن ''جوئے معانی'' پڑھ کر اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کون سی غزل کب لکھی گئی۔

''تیشۂ لفظ'' کی غزلیں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیانی عرصے کی تخلیق ہیں جب کہ ''جوئے معانی'' کی غزلوں کی تخلیق کا عرصہ ۱۹۶۷ء کے بعد شروع ہو کر کتاب کی اشاعت ۱۹۹۱ء کو محیط ہے۔ باقر صاحب کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ غیر مدوّن کلام کا عرصۂ تخلیق بھی ۱۹۵۶ء سے ۱۹۹۱ء تک ہے۔ یوں ان کا کل شعری سفر ۳۵ برس بنتا ہے۔ تاہم باقر صاحب کی بہن محترمہ تہذیب سجاد کا کہنا ہے کہ ان کی شاعری کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۵۱ء سے شروع ہو گیا تھا اور اسے ایک خاص واقعہ سے تحریک ملی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں بھی کیا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتی ہیں کہ وہ تین چار برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ بارہ برس کی عمر سے غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں لیکن اس طرف باقاعدہ مائل اسی وقت ہوئے جب وہ اسلامیہ کالج کراچی میں داخل ہوئے اور کالج میگزین میں چھپنا شروع کیا۔ محترمہ تہذیب سجاد صاحبہ باقر صاحب کے شعری سفر اور ان کی شاعری سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ خود بھی شاعرہ ہیں اور ''مشعلیں''، ''تلخیِ دوراں'' سمیت شاعری کی کئی کتابوں کی خالق ہیں۔ ''تلخیِ دوراں'' کو انھوں نے باقر صاحب کے نام معنون کیا ہے۔ انتساب کے الفاظ پر غور کرنے سے اس تعلقِ محبت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جو انھیں اپنے بھائی سے تھا۔

''اپنے بہت پیارے بھائی سجاد باقر رضوی کے نام جنھوں نے مجھے علم و ادب کے راستوں پر گامزن کیا اور اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھایا۔

وہ چل بسا حیات کا پیغام کس کو دیں
قاتل بھی سوگوار ہے الزام کس کو دیں

تہذیب۔''

(تلخیِ دوراں، ۱۹۹۳ء، ص ۳)

''کلیاتِ باقر'' میں شامل باقر صاحب کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ غیر مدوّن کلام

کی طرف رہنمائی محترمہ تہذیب سجاد کے ذریعہ ہی ہوئی۔ بیگم باقر نے جب ان سے میرا رابطہ کرایا تو اُن کی صاف شستہ اور نستعلیق زبان سُن کر میں حیران رہ گئی۔ اتنی خوبصورت گفتگو کرتی ہیں کہ جی چاہتا ہے، گھنٹوں سُنتے رہیں۔ اُنھوں نے مجھے جو کچھ فراہم کیا۔ اس میں اضافہ بھی ہوسکتا تھا۔ اگر میں نے کتاب ۴ر اکتوبر ۲۰۱۰ء (باقر صاحب کی سال گرہ کا دن) سے پہلے لانے کا ارادہ نہ کیا ہوتا۔ باقر صاحب کو ان کی ۸۷ ویں سال گرہ پر اس سے بہتر تحفہ اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے۔

باقر صاحب کی بیگم قیصر جہاں کی بے پناہ شفقتوں اور محبتوں نے مجھے اس طرح اپنے ساتھ باندھ رکھا ہے کہ میں ان سے الگ ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ انھوں نے اس کتاب میں حرفِ تشکر لکھ کر مجھے شرمندہ کیا۔ شکریہ تو مجھے ان کا ادا کرنا ہے کہ قدم قدم پر انھوں نے میری راہنمائی کی۔ مجھے پاس بٹھا کر باقر صاحب کی یادوں کو تازہ کیا۔ باقر صاحب کی زندگی کے بارے میں میرے ساتھ وہ باتیں شیئر کیں، جن تک کسی اور کی رسائی نہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے ''کلیاتِ باقر'' کی ترتیب و تہذیب کا کام سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائی اور آئندہ بھی اس کے فضل و کرم اور احسان کی امید رکھتی ہوں۔ باقر صاحب کے کلام میں جواہر ریزوں کی تلاش اور اس کی قدر و قیمت کا کام میں سخن فہم اور شاعری کے پارکھوں پر چھوڑتی ہوں۔ میں نے اپنی سی کوشش کر کے باقر صاحب کا کلام جمع کر دیا ہے۔ اب اس سے استفادے کی جو بھی صورتیں نکلیں گی ان سے باقر شناسی کے عمل کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔

باقر صاحب کی شاعری اُن کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ جس میں ہر رنگ اور ہر موسم خوشبو کا پیرہن لیے رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر تلخ

حقائق کا سامنا کیا اور اس سے انھیں کبھی وحشت نہیں ہوئی۔ انھوں نے معاشرے کے منفی رویّوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود زندگی کے مثبت پہلوؤں پر نظر رکھی۔ اُن کی شاعری میں ایک ایسے سچے انسان کی روداد ملتی ہے جو عمر بھر آفاقی قدروں اور ابدی صداقتوں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ کائنات کی خوب صورتی اور حُسن اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے لیکن شاعر اس فطری حُسن کو کس طرح اپنی شاعری میں برتتا ہے یہ اس کا اسلوب اور حسنِ نظر ہے:

تم رنگ میں دیکھو تو ہوں مُرجھایا ہوا پھول
آواز میں، میں ٹوٹتے شیشے کی صدا ہوں
ہر رنگ ہر آہنگ مرے سامنے عاجز
میں کوہِ معانی کی بلندی پہ کھڑا ہوں
نکلیں گی چٹانوں سے مری فکر کی نہریں
میں لفظ کے تیشے سے انھیں کاٹ رہا ہوں

ان اشعار کا لہجہ باقر صاحب کے اس پختہ یقین کی طرف اشارہ ہے جسے غالبؔ نے ''گنجینۂ معانی کا طلسم'' کہا ہے۔ لفظوں کی ایک ایسی طلسماتی فضا، جو تخیّل ہو کر بھی قاری کو حقیقت کا ادراک کرنے پر مجبور کردے۔ کسی شاعر کو یہ مقام مسلسل مشاہدے، گہرے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ باقر صاحب معاشرتی حقیقتوں کے عکاس ہیں اور اِسی معاشرتی حقیقت نگاری سے وہ جذبوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُن کا سفر خارجی دنیا سے داخلی دنیا کی طرف رواں ہوتا ہے۔ اِس سفر میں دانش اور جذبہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی حدّت سے پگھلتے اور باہم ایک ہوجاتے ہیں۔

ایک شاعر فکری سطح پر کتنا ہی بڑا نظریہ ساز کیوں نہ بن جائے مگر دل کی دنیا میں بسے ہوئے عاشق کو فراموش نہیں کر سکتا۔ جب بھی دل کے کوچے سے سنکی ہوا کا گزر ہوتا ہے تو دل اس کے نغموں سے زنجیر پا ہو جاتا ہے اور اسی سے وہ رنگ پھوٹتے ہیں جن سے گلوں میں خوئے وفا کا احساس ہوتا ہے۔ اسی احساس کی معطر خوشبو کے ساتھ عاشق دُور، بہت دُور تک سفر کرتا چلا جاتا ہے۔ باقر صاحب کی شاعری ایسی ہی حسین اور مدھر خوشبوؤں میں بسی ہوئی پڑھنے والے کو مشک بار کر دیتی ہے۔

باقر صاحب کی شاعری میں کلاسیکی موضوعات کے حوالے سے گل و بلبل، ساغر و مینا، آفتاب و ماہتاب اور ہجر و وصل کے استعارے نہیں ملتے۔ اُن کے یہاں اُداسی اور اندھیاری رات وغیرہ کے استعارے ایک منفرد انداز میں اُن کے تخلیقی عمل کے لیے مہمیز بنتے نظر آتے ہیں۔

حرکت زندگی کی علامت ہے۔ محنت، لگن اور مسلسل کوشش منزل تک پہنچنے کا راستہ آسان کر دیتی ہے۔ باقر صاحب کی شاعری میں ''لغزشِ پا'' کا استعارہ مسلسل حرکت کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر یہ حرکت بے مقصد نہیں ہے۔ ایسا سفر جس میں منزل کے نقوش غیر واضح اور مدھم ہوں، بے کار ہے۔ باقر صاحب کے اہداف بالکل واضح اور روشن ہیں۔ جس میں اُن کی طلب، جو امید کا استعارہ ہے، چاروں اور اپنی کرنیں بکھیر کر منزل تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ باقر صاحب کی شاعری ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہی نہیں بلکہ غم کی وہ لامتناہی قوت ہے جو انسان کو استقامت اور ثباتِ قدم عطا کرتی ہے اور جادۂ حیات پر چلتے ہوئے اُسے سفر کی صعوبتوں کا ادراک عطا کرنے کے ساتھ ساتھ سامانِ راحت و تسکین بھی فراہم کرتی ہے۔

کتاب کی ترتیب کے دوران میں، میں نے کئی بار ان کے اشعار کو پڑھا اور ہر

بار معانی کی ایک نئی سطح دریافت ہوتی محسوس ہوئی۔ باقر صاحب لفظ اور معانی کے اٹوٹ رشتے پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے تیشۂ لفظ سے کوہِ معانی کاٹنے کا جو کام اپنی شاعری میں کیا ہے وہ آج جوئے معانی بن کر زمینِ سخن پر رواں دواں ہے۔

اس کلیات کی ترتیب کے سلسلے میں میری فکری اور فنی رہنمائی کرنے والوں میں میرے استادِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا نام سرِ فہرست ہے۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں میرے تعلیمی سلسلے کو استوار رکھنے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

ایک دوسری شخصیت جس کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے جناب اعجاز احمد باجوہ کی ہے جن کے وسیلۂ جمیلہ نے مجھے اس درجے تک پہنچایا ہے۔ میرے یہ استاد بھی میری ہر کارکردگی کو کامیابی کی سطح تک پہنچانے کے لیے مجھ پر خاص شفقت کی نظر کرتے ہیں اور میری کامیابیوں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں بھی صحت و سلامتی سے رکھے۔ کلیاتِ باقر کے کمپوزر جناب تصور حسین کا شکریہ کہ انھوں نے دن رات ایک کر کے نہایت توجہ اور احتیاط سے کتاب کی کمپوزنگ مکمل کی اور آخر میں جناب سید محمد علی انجم رضوی کا شکریہ کہ انھوں نے اس بھاری بھرکم کلیات کی اشاعت میں دل چسپی ظاہر کی اور اِسے نہایت محدود وقت میں مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ اِن سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انھیں ہر اعتبار سے ثمر ور کرے۔ آمین!

عاصمہ اصغر
پی ایچ۔ ڈی اسکالر
یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال، لاہور

۸/اگست ۲۰۱۰ء

◆◆◆

اظہارِ تشکر

مجھے خوشی ہے کہ عاصمہ اصغر نے باقر صاحب کے سارے کلام کو یکجا کر کے اسے کلیات کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ میں عاصمہ کی اِس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور اس کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے اعلیٰ کامیابیوں سے نوازے۔ آمین!

کلیات کی ترتیب و تدوین اور مواد کی فراہمی میں باقر صاحب کی بہن محترمہ تہذیب سجاد نے گراں قدر تعاون کیا۔ اِسی طرح صدر شعبہ اُردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی خصوصی توجہ اور رہنمائی نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں ان سب کی ممنون ہوں۔

قیصر جہاں

قیصر جہاں

۸/اگست ۲۰۱۰ء

◆◆◆

تیشۂ لفظ

انتساب

مجتبیٰ حسین کے نام

جن کی تربیت سے میرے لفظوں کو زندگی ملی

قیصر کے نام

جن کی رفاقت سے میری زندگی کو معنویت ملی

دیباچہ (طبع دوّم)

''تیشۂ لفظ'' کی پہلی اشاعت آج سے بیس برس پہلے ہوئی تھی۔ اس اشاعت کا جواز تو شاید یہ تھا کہ اوروں کی طرح میں بھی اپنی اُس ''ذات'' کو جو مجھ سے بڑی ہے، اپنے آپ سے باہر دیکھنے کا آرزومند تھا لیکن اس دوسری اشاعت کا کیا جواز ہے یہ بات انیس ملک سے پوچھیے۔ انیس ملک ''کھلے'' وکیل اور ''پوشیدہ'' شاعر ہیں۔ قانون کے لفظ لفظ کی پرت پرت شناخت ان کا شعوری کام ہے۔ لفظ کے ساتھ ان کا جذباتی و وجدانی تعلق ان کی نظموں میں ظاہر ہوتا ہے۔ عقلی دلائل کے ''تیشہ'' سے مقدموں کا پہاڑ کاٹتے ہیں اور شعری منطق سے لفظوں کو منظم کرتے ہیں۔ پوری ذات کا اظہار اسی کو کہتے ہیں اور ''تیشۂ لفظ'' سے انیس ملک کی ذاتی مماثلت اسی طور ظاہر ہوتی ہے۔

بہر حال عزیزم انیس ملک کی ذاتی دلچسپی کے باعث ''تیشۂ لفظ'' دوبارہ شائع ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوسری اشاعت سے اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ اسی مناسبت سے اس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں بھی اضافہ ہوگا۔ قارئین سے میری گزارش یہ ہے کہ ناپسندیدگی کو میرے کھاتے میں ڈال دیں اور پسندیدگی کو انیس ملک کی طرف منتقل کردیں۔

اس کتاب کے نئے پڑھنے والوں کو میرا یہ مشورہ بھی ہے کہ اس میں اُن رویّوں

کی تلاش نہ کریں جو قیام پاکستان کے فوراً بعد شہرت پانے والے شاعروں کی خصوصیت ہیں۔ اس میں انھیں نرم اور لچکدار رومانی رویے، فطرت کے معصوم رویوں سے وابستگی اور مافوق الفطرت سے پیدا ہونے والی حیرت نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس اس میں معاشرتی رویے ملیں گے کہ فطرت سے معاشرت کی جانب سفر ایک قدرتی بات ہے۔ بڑھتے پھیلتے ہوئے شہروں میں گم ہونے کے خوف میں مبتلا وہ فرد ملے گا جو معاشرے سے نبرد آزما ہے۔ ٹکراتی، ٹوٹتی، بکھرتی اور خود کو بار بار سمیٹتی ہوئی اَنا ملے گی جو کشمکشِ حیات سے دوچار ہے۔ اس طرح اگر آپ چاہیں تو اس کتاب کو پرانی رومانویت اور نئی ہیئت کے درمیان کی کڑی کہہ لیں۔ آپ کو محبت، تلخی، جھنجھلاہٹ کے رنگ اور لہجے کی بلند آہنگی بھی ملے گی جو شہر کے شور و شغب میں گم ہونے کے لیے تیار نہیں۔

مرحوم ناصر کاظمی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا تھا تو اس کا نام ''شہری فرہاد'' رکھا تھا۔ ناصر کاظمی محض اعلیٰ درجے کے شاعر ہی نہیں تھے۔ شاعری کے عظیم پارکھ بھی تھے۔ ان کے جیسا لفظ شناس میں نے (نہیں) دیکھا۔ ''شہری فرہاد'' کے عنوان کو ذہن میں رکھیے کہ یہی اس کتاب کے شعری رویوں کی کنجی ہے۔

تاہم یہ لازم نہیں کہ آپ میرے مشورے کو ضرور مانیں۔ شاعر لفظوں میں زندگی تو ضرور بھرتا ہے لیکن اس کی زندگی کے معنی پڑھنے والے ہی متعین کرتے ہیں۔ میرا کام اب محض یہ رہ گیا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں اور آپ کے اور کتاب کے درمیان سے ہٹ جاؤں لیکن چلتے چلتے مجھے انیس ملک کا شکریہ بھی ادا کر لینے دیجیے کہ انھی کے حوالے سے میری اور آپ کی ملاقات ہوئی۔

۳۱ مئی ۱۹۸۹ء

سجاد باقر رضوی

◆◆◆

شہری فرہاد

آج سے سات آٹھ سال پہلے باقر صاحب کو میں نے لاہور کے ایک قہوہ خانے میں دیکھا تھا کہ چند نوجوانوں کے حلقے میں بلند آواز کے ساتھ بے تکان بولتے جا رہے ہیں اور نوجوان یوں سہمے ہوئے بیٹھے ہیں جیسے مرغی کے بچے بادل کی گرج سن کر سہم جاتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی مگر وہ اپنی آواز کے سحر میں گم مسلسل بولتے جاتے۔ جب تعارف ہوا تو انتظار حسین کے ماتھے پر ایک بھنور سا بن گیا اور ہونٹوں کے نیچے ہنسی کی ایک لکیر دوڑتی نظر آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ انگریزی کے استاد ہیں، شاعر ہیں اور کرّار حسین صاحب اور عسکری صاحب کے شاگرد ہیں لیکن انتظار حسین کے ماتھے کی گرہ نہ کھلی:

باقر سے مل کے آپ نے صورت تو دیکھ لی
اب دل میں آ کے حسنِ طبیعت بھی دیکھیے

پہلی ہی ملاقات میں باقر صاحب سے اپنی ٹھن گئی۔ اُن کی دھواں دھار تقریر سن کر کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، کوئی دیوار کی طرف منہ پھیر لیتا، کوئی تاؤ کھاتا اور کوئی صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا مگر باقر صاحب کی تقریر جاری رہتی۔ ایک مرتبہ حلقۂ اربابِ ذوق کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اعجاز حسین بٹالوی نے میرے کان

میں آ کر کہا کہ مضمون خاصا طویل ہے اور عمر عزیز کوتاہ...... باقر صاحب ورق پر ورق اُلٹتے جاتے اور اعجاز حسین بٹالوی کہتے جاتے کہ یہاں تک تو مضمون اچھا جا رہا ہے، پروفیسر صاحب اب بھی اپنا دفتر لپیٹ لیں تو خیریت ہے ورنہ بات بگڑ جائے گی۔ لیکن پروفیسر صاحب جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو مجمع پر پوری طرح لاٹھی چارج کر کے ہی سانس لیتے ہیں۔ قصہ کوتاہ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ جانِ ناتواں لاہور کی ادبی محفلوں میں دَر آئی۔ اور اب تو شہر شہر باقر صاحب کے مداحوں اور شاگردوں کا ایک لشکر موجود ہے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ شاعر کا پیٹ کسی طرح نہیں بھرتا:

کشتِ ہستی تو مجھے پہچان تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں

باقر صاحب نرے غزل گو ہی ہوتے تو نقاد اُنھیں کب کا ٹھکانے لگا چکے ہوتے لیکن اُنھوں نے ایک ہزار داستان بھی پال رکھی ہے جو شاعری اور سامعین کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے۔ ہماری پرانی داستانوں کے جنات کی جان کسی طوطے کے جسم میں قید ہوتی ہے اور ان داستانوں کے شہزادے اس طوطے کو قابو میں لانے کے بعد ہی اپنے من کی شہزادی کو جن کے چنگل سے رہا کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں، مگر باقر صاحب کی ہزار داستان ہوشیار نکلی کہ نقاد اسے قابو میں نہ لا سکے۔ اب اگر باقر صاحب کا یہ قول مان لیا جائے کہ تنقید، شاعری اور علوم کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے تو ہمارے اُن نقادوں کا تو پٹرا ہو جاتا ہے جو ''دریں چہ شک'' کی رٹ سے آگے نہیں بڑھتے۔ باقر صاحب کی ہزار داستان اپنے فریضے میں کہاں تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ تو عسکری صاحب ہی کو کرنا چاہیے۔ میں تو یہاں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ شاعر کی شاعری اور اُس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں باقاعدہ مثالیں تو مغرب کے ادب ہی میں

ملیں گی لیکن اردو ادب بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ میؔر نے اپنے تذکرے میں، غالبؔ نے اپنے خطوط میں، حالیؔ نے مقدمہ شعروشاعری میں، پھر ہمارے زمانے میں فراقؔ صاحب نے اپنے مضامین میں شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کا عکس اُن کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

شاعر کے بارے میں جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اُسے اپنے نظریات کو اپنی شاعری ہی تک محدود رکھنا چاہیے اُن سے تو کچھ کلام نہیں، البتہ جو لوگ شاعر کے کلام میں اُس کے نظریات منظوم صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اُن کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں اُنھیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔ شاعر کا مطالعہ اور اُس کے نظریات خام لوہے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دمِ شمشیر بن کر اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ اب اگر کوئی شاعر ہفت اقلیم کے اساطیر اور واقعات کو بھی منظوم کر کے دکھا دے تو بھی کوئی معقول آدمی اُسے شاعر نہیں کہے گا۔

باقر صاحب نے اپنے تنقیدی مضامین میں مختلف موضوعات اور مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور کچھ نظریات مرتب کیے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُنھوں نے اپنے ادب کو اس کے تہذیبی رشتوں اور اپنے عہد کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی ہے۔ اُن کے نظریات کا نچوڑ یہ ہے کہ معاشرے میں تخلیقی رویّے ہونے چاہییں اور تخلیقی رویّے پوری ذات کو منظم کیے بغیر ناممکن ہیں۔ یہ کام تو پوری طرح ایک بڑا شاعر ہی کر سکتا ہے تاہم باقر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معاشرتی اقدار کا شعور شاعر کی شخصیت کو منظم کرتا ہے اور اس تنظیم کو وہ تخلیقی رویّہ کہتے ہیں اور تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے معاشرے میں زندگی کے لیے یہ رویّہ ضروری ہے کیونکہ جب ایک معاشرہ مادی ترقی کے مرحلوں میں داخل ہوتا ہے تو روحانی اور

اخلاقی قدریں پیچھے رہ جاتی ہیں اور فکرِ بیش و کم کی دوڑ دھوپ میں آدمی کا ذہن غیر تخلیقی اور بنجر ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ باقر صاحب اپنے نظریے پر کسی حد تک پورے اترتے ہیں، اُن کی غزل میں اس رویئے کا احساس جا بجا موجود ہے۔ اپنے اردگرد جب وہ بنجر ذہنوں کو تخلیقی سرگرمیوں کی راہ میں حائل دیکھتے ہیں تو احتجاج کرتے ہیں:

کیا ملا اے زندگی قانونِ فطرت سے مجھے
کچھ ملا بھی حق تو باطل کی وساطت سے مجھے
میرے مالک میں تکبّر سے نہیں ہوں سربلند
سر جھکا اتنا، ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے

یہ شاعرانہ احتجاج باقر صاحب کی غزل کا ایک اہم عنصر ہے اور اُن کے طرزِ بیان کو دیکھنے کے لیے شاید اُن کی یہ ایک غزل ہی کافی ہے۔ بقول محبوب خزاں اس غزل میں شاعر خرچ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

باقر صاحب معاشرے کے شاعر ہیں اس لیے اُن کا رویہ نہ تو محض داخلی ہے اور نہ محض خارجی ہے بلکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایک ایسے مرکز پر مجتمع کرنا چاہتے ہیں جہاں عقل اور جذبہ گلے ملتے نظر آئیں۔ جذبہ اُن کے اشعار میں بالعموم عقل کا بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ اور شاید اسی لیے وہ میر کی بجائے غالب کو اپنا رہبر بناتے ہیں کیونکہ غالب کا کلام ایک عقل مند باپ کا سایہ ہے اور مصائب کی دھوپ میں باقر صاحب اسی سائے کی پناہ لیتے ہیں۔ لیکن غالب کا سایہ ایک ایسے جن کا سایہ ہے کہ اگر شاعر ذہین آدمی نہ ہو تو یہ اُسے حواس باختہ کر دیتا ہے یا عقلِ محض بنا کر ٹھکانے لگا دیتا ہے لہٰذا باقر صاحب اس سائے سے بچ کر غالب شکن یگانہ کے پینتروں کو اپناتے ہیں اور اپنی اَنا کی پیاس بجھاتے ہیں:

میں وفاداری میں شرطِ استواری پوچھ لوں
آپ نادم ہوں تو گالی دیں خجالت سے مجھے

حیف کس کے آگے لفظوں کے دیے روشن کیے
کتنی اُمیدیں ہیں اندھوں کی بصارت سے مجھے

....

اندھوں کے آگے فن کے جلائے دیے تو پھر
بہروں کے آگے کیجیے عرضِ ہنر تو کیا

اس نوع کے اشعار باقر صاحب کی غزل میں جا بجا موجود ہیں جن میں زندگی کے بنجر پن کا احساس تلخ تر ہو جاتا ہے اور بنجر معاشرے کی اندھی، گونگی اور بہری مخلوق کے دل و دماغ کی مہریں توڑنے کے لیے وہ خطیب بن جاتے ہیں۔ مگر خودنگری اور خطابت جب خودستائی کی سطح پر اتر آتی ہے تو وہ خودشکنی کرتے ہیں اور انا کا شعور انھیں شکست کا احساس دلاتا ہے:

گونجی ہوئی ہے ایک کھنک، بج رہے ہیں کان
گویا شکستِ دل کی صدا ہے ہمارے ساتھ

....

غمِ زمانہ سے دل تنگ تھے بہت باقرؔ
سمٹ کے رہ گئے احساسِ بے کسی کی طرح

تنہائی اور شکست کا احساس آدمی کو انتہا پسند بنا دیتا ہے مگر یہی احساس شاعر کی تنظیمِ ذات کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ البتہ شاعر کسی ایک نظریے کو آخری طور پر قبول نہیں کرتا کیوں کہ وہ شاعری کو طریقِ زندگی بھی سمجھتا ہے:

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

شاعر کی نامرادی ایک بنجر ذہن کی نامرادی نہیں ہوتی اور وہ دنیاوی راحتوں کی وہ

قیمت ادا کرنا نہیں چاہتا جسے ایک بنجر ذہن دوسروں کی خوشیاں چھین کر فی الفور ادا کر دیتا ہے۔ شاعر کی تقدیر اپنے آپ کو خرچ کرتے رہنا ہے اور اس فضول خرچی سے وہ اپنے فکر و احساس کی تنظیم تو کر سکتا ہے زندگی کی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتا۔ پس جہاں جہاں شاعر خرچ ہوتا نظر آئے وہاں وہاں وہ شاعر ہے اور جہاں وہ کامیاب دکھائی دے وہاں اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ شاعر تو ہجر کی راتوں کا قرض چکاتے چکاتے زندگی گزار دیتا ہے اور وصل کے لمحے اُس کے دروازے پر دستک دے دے کر لوٹ جاتے ہیں:

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

باقر صاحب کے ذہن پر ہجر کی راتوں کے قرض کا احساس شاید اس قدر شدید ہے کہ اُن کی دنیا میں فطرت کے خوبصورت فرشتے نہیں اترتے۔ رات، چاند، ستارے، پرندے اور بدلتے موسموں کے رنگ اُن کی غزل میں کہیں نظر نہیں آتے۔ بس ایک اندھیری رات ہے یا مصروف دن کے ہنگامے جس کے بیان کے لیے انہوں نے آواز، گونج، سائے اور ہوا کے استعارے وضع کیے ہیں اور ان استعاروں کے پیچھے کراچی شہر کا ہنگامہ صاف سنائی دیتا ہے جہاں انہوں نے ہوش سنبھالا:

گھیرے ہے چار سمت سے آواز شہر میں
باہر بسوں کی گھر میں ہے انفاس کی صدا
میں شہرِ آہنی میں گھرا ہوں جنابِ خضر
سنتا ہوں قعرِ بحر سے الیاس کی صدا

....

باہر وہ گونج ہے کہ ٹھہرتے نہیں حواس
کتنے ہی شور سینے کے اندر اٹھا کریں

....

یہ دھوپ چھاؤں ہے دنیا کی خود مرا سایہ
مرے قریب سے گزرا ہے اجنبی کی طرح

ایک شاعر کتنا ہی بڑا فلسفی کیوں نہ بن جائے وہ اپنے دل کی دنیا میں ہنستے کھیلتے معصوم بچے اور فریاد کرتے ہوئے عاشق کو نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ معصوم بچہ اور عاشق ہی شاعری کی سلطنت میں بے کھٹکے داخل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس عاشق نے باقر صاحب سے بعض ایسے اشعار بھی کہلوائے ہیں جن میں معصوم جذبات ہیں، حسن و عشق کے معاملات ہیں، پرانی داستانوں کی فضا ہے اور صنعتی دنیا کی بے رنگی کے درمیان محبوب کی گلی بھی ہے جہاں شاعر کا شعور اور وقت کا بے چین دھارا سکون حاصل کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ پر سکون لمحے تخلیق کے لیے ضروری ہیں۔ اور زیر نظر شاعر نے شاید انھی لمحوں میں تخلیق فن اور تخلیقی عمل سے متعلق کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو اُس کی غزل میں ایک لطیف سمت کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ باقر صاحب فن میں فطرت اور فطرت میں فن کے متلاشی ہیں اور اس ضمن میں اُنھوں نے آواز، رنگ حنا اور خوشبو کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے اور کلی کے پھول بن جانے تک مختلف مراحل کو تخلیقی عمل کا استعارہ بنایا ہے:

زباں کھلی ہے تو دل پھٹ پڑا ہے صورتِ گل
وگرنہ ہم بھی تھے گم آپ میں کلی کی طرح

....

چٹکا جو دل تو مثلِ گلِ تر بکھر گیا
خوشبو صبا کے ساتھ تھی نغمہ صدا کے ساتھ

ہوں بند خیالوں میں کہ جوں پھول میں خوشبو
آزادہ روی میں صفتِ موجِ صبا ہوں

....

اُمڈا ہے سیلِ موسمِ گل پھٹ پڑا ہے دل
باقرؔ کی تند و تلخ نوا پر نہ جایئے

باقر صاحب کی اکثر غزلیں مسلسل یا کم از کم ایک موڈ کی غزلیں ہیں جو اچھی غزلوں کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔فنی اعتبار سے اُن کی غزلوں میں جو چیز ہمیں سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ہے لفظوں کا آہنگ اور اشعار میں اُن کی موزوں نشست۔شاعر کا ایک ذخیرۂ الفاظ ہے اور یہ الفاظ مطالب ومعانی کی امانت کو بلا تاخیر قاری کے ذہن تک پہنچا دیتے ہیں۔البتہ بحور کی تعداد محدود ہے پھر چھوٹی بحروں کی کمی کا شکوہ تو مجھے بھی رہے گا۔میرؔ صاحب کی طویل بحر میں اُن کے قدم پوری طرح نہیں جمتے وہ شاید اس لیے کہ وہ شعوری طور پر غالبؔ کے پیرو ہیں۔

مجموعی طور پر باقر صاحب کی غزل میں آدمی فطرت کی تمام چیزوں پر حاوی ہے۔اُن کا مخاطب آدمی ہے جس کی وجہ سے زورِ خطابت اُن کے کلام کا جزوِ اعظم بن گیا ہے اور کہیں کہیں تو ان کی شاعری کا ظاہر و باطن ایک ہو جاتا ہے کیوں کہ ابہام کے پردے اور زبان و بیان کی باریکیاں زورِ خطابت کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔اور یہ زورِ خطابت اُس وقت اور بھی لطف دیتا ہے جب باقر صاحب مشاعرے میں اپنی غزل خود پڑھ کر سناتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تلوار اور گھوڑے کے جوہر میدان ہی میں آ کر کھلتے ہیں۔

باقر صاحب غزل کے شاعر ہیں اور وہ غزل کی روایت سے بغاوت نہیں کرتے۔پھر اُن مخصوص معنوں میں وہ نئے شاعر بھی نہیں جو آج کل کے نئے شاعروں کا

طرۂ امتیاز ہے۔ وہ اپنی غزل کو جیلے اور غریب الفاظ سے نہیں سجاتے نہ بات بات پر اُداس ہوتے ہیں، نہ گریبان چاک کرتے ہیں اور عجب تو یہ ہے کہ ایک منٹ کے لیے بھی تختۂ دار پر لٹکتے نظر نہیں آتے۔ شاعری میں کبھی یہ رویہ شیوۂ اہل نظر کی آبرو کا باعث تھا مگر اندھا دھند تقلید کی وجہ سے اب یہ رویہ مردہ اور غیر شاعرانہ ہو چکا ہے۔...... جسے دیکھیے وہ کھاتے پیتے سولی پر لٹکا ہوا نظر آتا ہے یا ذاتی علامتوں کی چادر اوڑھے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھا ہے۔ کوئی لسانی تجربوں کی فکر میں غلطاں ہے، کوئی ہیئت کے تجربوں میں سرگرداں ہے اور بعض شوقین مزاج تو حالاتِ حاضرہ پر زبانی جمع خرچ ہی کو عصری شعور کا نام دیتے ہیں۔ تو صاحبو اگر اسی کا نام نئی شاعری ہے تو باقر صاحب ان معنوں میں نئے شاعر نہیں ہیں:

اس دورِ خرافات میں بے قدر ہوں پھر بھی
تو جتنا سمجھتا ہے میں کچھ اُس سے سوا ہوں

باقر صاحب شاعروں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے محنت اور جانفشانی کو ایک تخلیقی رویہ بنانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ وہ شہری فرہاد ہیں، اور زندگی کا پہاڑ کاٹنا اُن کا پیشہ ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "تیشۂ لفظ" رکھا ہے اور تیشے سے وہ اپنا سر پھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے کہ اُن کی شیریں خود زندگی ہے۔

۲۹ر جنوری ۱۹۶۸ء
لاہور

ناصر کاظمی

◆◆◆

میرے مالک میں تکبّر سے نہیں ہوں سربلند
سَر جھکا اتنا، ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے

پوچھو مجھے اے ہم نفساں کون ہوں کیا ہوں
یارو میں کوئی حشر کے میداں میں کھڑا ہوں

تم رنگ میں دیکھو تو ہوں مرجھایا ہوا پھول
آواز میں، میں ٹوٹتے شیشے کی صدا ہوں

میری بھی حکایت ہے وہی دل زدگی کی
پر درد کے عنوان میں، مضمونِ جدا ہوں

کچھ میرے ہی دم سے ہیں بہاروں کے معانی
میں پیروِ گل، گل کی طرح چاک قبا ہوں

ہوں بند خیالوں میں کہ جوں پھول میں خوشبو
آزادہ روی میں صفتِ موجِ صبا ہوں

خواہش پہ مجھے ٹوٹ کے گرنا نہیں آتا
پیاسا ہوں مگر ساحلِ دریا پہ کھڑا ہوں

شاید یہی تریاق بنے زہرِ فنا کا
میں تلخیِ ایام کا ست کھینچ رہا ہوں

پھولوں کی رفاقت میں تو پائے ہیں پھپولے
کانٹوں سے ہے اُمید کہ میں آبلہ پا ہوں

دن روزِ قیامت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا
تنہا ہوں کہ خود سائے سے بھی اپنے جدا ہوں

رات آئے تو سو جاؤں اندھیروں سے لپٹ کر
میں صبح سے ڈرتا ہوں کہ سورج کا ڈسا ہوں

کترا کے نہ چل راہ بھٹک جائے گا راہی
میں رہروِ اُمید کا نقشِ کفِ پا ہوں

اس دورِ خرافات میں بے قدر ہوں پھر بھی
تو جتنا سمجھتا ہے میں کچھ اُس سے سوا ہوں

ہر رنگ ہر آہنگ مرے سامنے عاجز
میں کوہِ معانی کی بلندی پہ کھڑا ہوں

نکلیں گی چٹانوں سے مری فکر کی نہریں
میں لفظ کے تیشے سے انھیں کاٹ رہا ہوں

میں کیمیا گر خود کو جلاتا ہی رہوں گا
اور تو یہ سمجھتا ہے کہ جینے سے خفا ہوں

پیدا مرے نغموں سے ہوئیں نور کی لہریں
میں خالقِ تہذیب اندھیروں کی ضیا ہوں

باقرؔ مجھے کچھ دادِ سخن کی نہیں پروا
میں شہرِ خموشاں میں ہوں اور نغمہ سرا ہوں

(فروری، ۱۹۶۶ء)

میں ہم نفساں جسم ہوں وہ جاں کی طرح تھا
میں درد ہوں وہ درد کے عنواں کی طرح تھا

جس کے لیے اک عمر کنویں جھانکتے گزری
وہ ماہِ کراچی مہِ کنعاں کی طرح تھا

تو کون تھا کیا تھا کہ برس گزرے پر اب بھی
محسوس یہ ہوتا ہے رگِ جاں کی طرح تھا

جس کے لیے کانٹا سا چبھا کرتا تھا دل میں
پہلو میں وہ آیا تو گلستاں کی طرح تھا

اک عمر اُلجھتا رہا دنیا کی ہوا سے
کیا میں بھی تیرے کاکلِ پیچاں کی طرح تھا

کچھ عمرِ گریزاں سے مرے ہاتھ نہ آیا
ہر لمحہ ترے گوشۂ داماں کی طرح تھا

ڈوبے سے کہاں پیاس بجھی اہلِ طلب کی
میں وادیٔ گل میں بھی بیاباں کی طرح تھا

جینا تو غضب ہے مگر اے عمر عجب ہے!
تجھ کو تو خبر ہے وہ مری جاں کی طرح تھا

اے رات کے اندھیارے میں جاگے ہوئے لمحو
ڈھونڈو اُسے وہ خوابِ پریشاں کی طرح تھا

مٹی کو یہاں پاؤں پکڑنا نہیں آتا
میں شہر میں بھی گرد کے طوفاں کی طرح تھا

لو حرفِ غزل بن کے نمایاں ہوا باقرؔ
کل رمز صفت معنیٔ پنہاں کی طرح تھا

(اگست، ۱۹۶۳ء)

◆◆

خواہش میں سکوں کی وہی شورش طلبی ہے
یعنی مجھے خود میری طلب ڈھونڈ رہی ہے

دل رکھتے ہیں آئینۂ دل ڈھونڈ رہے ہیں
یہ اُس کی طلب ہے کہ وہی خود طلبی ہے

تصویر میں آنکھیں ہیں کہ آنکھوں میں ہے تصویر
اوجھل ہو نگاہوں سے تو بس دل پہ بنی ہے

دن بھر تو پھرے شہر میں ہم خاک اُڑاتے
اب رات ہوئی چاند ستاروں سے ٹھنی ہے

ہیں اس کی طرح سرد یہ بجلی کے ستوں بھی
روشن ہیں مگر آگ کہاں دل میں لگی ہے

پھر ذہن کی گلیوں میں صدا گونجی ہے کوئی
پھر سوچ رہے ہیں کہیں آواز سنی ہے

پھر روح کے کاغذ پہ کھنچی ہے کوئی تصویر
ہے وہم کہ یہ شکل کہیں دیکھی ہوئی ہے

کترائے تو ہم لاکھ رہِ وحشتِ دل سے
کانوں میں سلاسل کی صدا گونج رہی ہے

باقر مجھے فرصت نہیں شوریدہ سری کی
کاندھوں پہ مرے سر ہے کہ اک دردِ سری ہے

(جنوری ۱۹۶۱ء)

شعلہ سا کوئی برقِ نظر سے نہیں اٹھتا
اب کوئی دھواں دل کے نگر سے نہیں اٹھتا

وہ رونقِ کاشانۂ دل بجھ سی گئی ہے
اب شور کوئی اس بھرے گھر سے نہیں اٹھتا

کب طاقتِ شوریدہ سری سر کو جو ٹکرائیں
وہ ضعف ہے اب سر ترے در سے نہیں اٹھتا

اس جنبشِ مژگاں کا ہوں شرمندۂ احساں
یہ بارِ گراں اپنی نظر سے نہیں اٹھتا

لبیک کہے ناقۂ لیلیٰ کو بھلا کون
اب قیس کوئی گردِ سفر سے نہیں اٹھتا

تبدیل ہوئی آب و ہوا شہرِ وفا کی
اب درد کا طوفان ادھر سے نہیں اٹھتا

یوں راہِ طلب دیتی ہے آواز ہمیں بھی
اب پاؤں کسی بات کے ڈر سے نہیں اٹھتا

دیوانے کو نیند آ گئی تاریکیِ شب میں
سویا ہے تو اب خوفِ سحر سے نہیں اٹھتا

یارو اسے دیکھو کہیں باقرؔ تو نہیں ہے
پہروں جو کسی راہ گزر سے نہیں اٹھتا

(جولائی، ۱۹۵۸ء)

دل ہے تو مقاماتِ فغاں اور بھی ہوں گے
سر ہے تو ابھی سنگِ گراں اور بھی ہوں گے

ہم سے، کہ ہے سامانِ فراغت بھی جنوں بھی
تصویر کے پردے میں نہاں اور بھی ہوں گے

واں سلسلۂ زلف میں خم بڑھتے رہیں گے
یاں مشغلۂ غم میں زیاں اور بھی ہوں گے

واں بوئے وفا وہم کو سہ چند کرے گی
یاں رنگِ تغافل پہ گماں اور بھی ہوں گے

ہاں رسمِ مداراتِ جنوں اور بڑھے گی
ہاں دشمنِ دل آفتِ جاں اور بھی ہوں گے

ہاں وجہِ گرفتاریِ دل سب کے معلوم
ہاں طرزِ ستم ہائے نہاں اور بھی ہوں گے

ہاں اور بڑھے گی قد و گیسو کی حکایت
ہاں قصۂ کوتاہئِ جاں اور بھی ہوں گے

بھڑکے گی ابھی آتشِ شوق اور سرِ دار
ہاں شعلہ لباں سرو قداں اور بھی ہوں گے

ہاں مرحلۂ شوق کے عنواں ہیں ابھی اور
باقرؔ سے کچھ آشفتہ بیاں اور بھی ہوں گے

(دسمبر،۱۹۵۸ء)

هم رازِ گرفتاریِ دل جان گئے ہیں
پھر بھی تری آنکھوں کا کہا مان گئے ہیں

تو شعلۂ جاں، نکہتِ غم، صوتِ طلب ہے
ہم جانِ تمنا تجھے پہچان گئے ہیں

کیا کیا نہ ترے شوق میں ٹوٹے ہیں یہاں کفر
کیا کیا نہ تری راہ میں ایمان گئے ہیں

اس رقص میں شعلے کے کوئی سحر تو ہو گا
پروانے بڑی آن سے قربان گئے ہیں

کھینچے ہے مجھے دستِ جنوں دشتِ طلب میں
دامن جو بچائے ہیں گریبان گئے ہیں

باقرؔ ہے اُسی گردِ رہِ دل کا پرستار
جس راہ سے کچھ صاحبِ دیوان گئے ہیں

(اپریل،۱۹۶۷ء)

ہو وقت کا احساس تو کیا کیا نظر آئے
دیروز میں شامل ہے جو فردا نظر آئے

کچھ دیر تو ہو تشنگیِ شوق کی تسکیں
ہو ریگ مگر دُور سے دریا نظر آئے

اک وہ کہ جنھیں خود نگری راس نہ آئی
اک ہم کہ بھری بزم میں تنہا نظر آئے

یارو اُسے گرداب سے خالی نہ سمجھنا
پایاب کنارے سے جو دریا نظر آئے

ہے روشنیِ دل سے اندھیرے کا جگر چاک
اندھوں کو بھلا خاک سویرا نظر آئے

اس لمحۂ تخلیق کے قربان کہ جس میں
ہر لفظ میں نیرنگِ تماشا نظر آئے

جو دل کے اندھیروں میں ہیں روپوش نکل آئیں
گر روشنیِ رنگِ تمنا نظر آئے

سوئے تو ہم آغوش رہے ہم ترے غم سے
جاگے تو حریفِ غمِ دنیا نظر آئے

یوں ترکِ تمنا کا ارادہ نہیں کرتے
کیا ہو گا جو وہ جانِ تمنا نظر آئے

وہ ذرہ نواز آج کہاں ملتے ہیں باقرؔ
ذرّے میں جنھیں وسعتِ صحرا نظر آئے

(جون، ۱۹۵۸ء)

◆◆

❁

کیا عشق کا لیں نام ہوس عام نہیں ہے
اندھوں کو اندھیرے میں کوئی کام نہیں ہے

تھا جام تو اس آس پہ بیٹھے تھے کہ مے آئے
مے آئی تو رندوں کے لیے جام نہیں ہے

جیتے ہو تو جینے کا عوض زیست سے مانگو
موت اپنا مقدر ہے یہ انعام نہیں ہے

کٹ جائے گی یہ رات گزارو کسی کروٹ
اب صبح سے پہلے تو کوئی شام نہیں ہے

جیتے تھے کہ سر دوش پہ تھا بارِ گراں تھا
مرتے ہیں کہ سر پر کوئی الزام نہیں ہے

یاں روشنیِ صبح تو واں نکہتِ گل ہے
یوں حسنِ گریزاں کا کوئی نام نہیں ہے

خود وقت کو ملتا ہے سکوں تیری گلی میں
سنتے ہیں وہاں گردشِ ایام نہیں ہے

سایہ ہوں مگر مہرِ درخشاں سے ہے نسبت
ظلمت ہوں پر اندھوں سے مجھے کام نہیں ہے

باقرؔ سے نہیں عزتِ سادات پہ کچھ حرف
عاشق تو بنا پھرتا ہے بدنام نہیں ہے

(جولائی ۱۹۶۱ء)

◆◆

اِک راحتِ دل وحشتِ دل آج بہم ہے
یاد اس کی بہت خوب سہی پھر بھی ستم ہے

لمحوں کا تسلسل ہے نہ لذّت ہے نہ آزار
اک شوق ہے اُس کا سو زیادہ ہے، نہ کم ہے

جس راہ سے گزرے تھے کبھی قافلے دل کے
اُس راہ پہ خوابیدہ ہر اک نقشِ قدم ہے

اک روشنیٔ طبع ہے جینے کا سہارا
پھر رات اندھیری ہے کہ یہ بھی کوئی دم ہے

پیمانِ وفا، شوقِ جفا، عرضِ تمنا
ہر لفظ معانی سے جدا ہو کے رقم ہے

نکہت تھی، ڈھلی نور میں کیا اس کا بیاں ہو
پوجو تو خدا ہاتھ لگاؤ تو صنم ہے

پاکیزگیِ شعلۂ رخسار تو دیکھو
وہ جانِ حیا حجتِ تقدیسِ حرم ہے

پروردۂ یک برقِ جگر سوز ہوں میں بھی
حق یہ ہے کہ وہ قہر نگاہی بھی کرم ہے

باقرؔ یہ حدیثِ لب و رخسار بڑی بات
اب یہ بھی غنیمت ہے کہ جینے کا بھرم ہے

(اگست، ۱۹۵۸ء)

◆◆

اس دل کا برا ہو یہ کسی طور لگے بھی
یوں ہم ترے کوچے میں کئی بار گئے بھی

آشفتہ مزاجوں کا ہے کیا ذکر کہ وہ لوگ
جس طرزِ تغافل پہ مرے اس پہ جیے بھی

اب کون کہے تجھ کو خبر ہے کہ نہیں ہے
کچھ لوگ تری بزم میں آئے بھی گئے بھی

بس آپ ہی گھل گھل کے مرا جائے ہے باقرؔ
کمبخت کہیں کھل کے کوئی بات کہے بھی

(دسمبر ۱۹۵۶ء)

راہوں کے اونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ہاں رہروِ مراد قدم رکھ سنبھال کے

فتنوں کو دیکھ اپنے قدم روک بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ہیں یہ دن وبال کے

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساطِ دہر
میں خود ہی کھیل ہار گیا دیکھ بھال کے

سامانِ دل کو بے سروسامانیاں ملیں
کچھ اور بھی جواب تھے میرے سوال کے

لمحوں کی لَے پہ گزری ہیں راتیں نشاط کی
کس دھن میں دن کٹیں گے یہ رنج و ملال کے

تخلیق ہے مری تری تخلیق سے الگ
میں بھی بناتا رہتا ہوں پیکر خیال کے

پیاسی زمینِ دل ہے پڑا قحطِ فصلِ شوق
ہاں اے ہوا کدھر گئے دن برشگال کے

باقرؔ یہ دانت بیچ زباں بند کیوں ہوئی
قائل تو آپ بھی تھے بہت قیل و قال کے

(اپریل، ۱۹۶۷ء)

اس سادہ دل سے کچھ مجھے باقرؔ گلہ نہ تھا
وہ باوفا ہو کیا جو کبھی بے وفا نہ تھا

دل ان سے مل گیا ہے جو ملتے نہیں کبھی
جو مل گئے ہیں ان سے کبھی دل ملا نہ تھا

باندھا پرِ شکستہ نے رشتہ زمیں کے ساتھ
اُڑنے کا شوق بھی مجھے حد سے سوا نہ تھا

منزل وفا کی تھی حدِ کونین سے پرے
کیا دل گرفتگاں کے لیے راستا نہ تھا

پھرتی تھی لے کے شورشِ دل کوبکو ہمیں
منزل ملی تو شورشِ دل کا پتا نہ تھا

طوفانِ بحرِ زیست میں خس کی مثال میں
پانی میں بہہ رہا تھا مگر ڈوبتا نہ تھا

ہاں جادۂ حیات میں تیری گلی بھی تھی
ہاں یہ بھی میری سست روی کا بہانہ تھا

دن ایسے پھر گئے کہ مقابل وہ آ گیا
جو میری سمت مڑ کے کبھی دیکھتا نہ تھا

ہاں وہ بھی دن تھے جب غمِ شیریں تھا بے ستوں
پر کوئی کوہِ تلخیِ جاں کاٹتا نہ تھا

اب آہ بھی بھریں تو چٹختا ہے جا بجا
سنگِ گرانِ غم سے جو دل ٹوٹتا نہ تھا

زنجیر کی صدا سے گریباں کے چاک تک
میرے بھی مشغلے تھے میں بے دست و پا نہ تھا

سَر نے مرے دیا تجھے آشفتگی کا نام
تجھ کو تو کوئی شورشِ غم پوچھتا نہ تھا

باقرؔ خودی کو چھوڑ چلے کس کے واسطے
تم جس کو پوجتے تھے وہ کافر خدا نہ تھا

(جون،۱۹۶۱ء)

الفاظ اگر نہیں تو نگاہوں سے کام لے
نظریں جھکا کے تو مرے دل کا سلام لے

لفظوں میں میری آنکھ بھی دل بھی شریک ہے
تو میری جان صرف لغت سے نہ کام لے

تیری نظر کے تار پہ مضرابِ دل ہے شعر
حسنِ نگاہ دے مجھے حسنِ کلام لے

اے جانِ شوق شعلہ لبی کو ہوا نہ دے
اے روحِ فن قیامتِ رفتار تھام لے

اب طورِ دل پہ آ تجھے جلوے دکھائی دیں
پیغمبری نہیں تو یہ عالی مقام لے

بکتے ہیں شہرِ شوق کے یہ شعر، تیری نذر
لا ہاتھ مجھ سے اپنی محبت کے دام لے

باقرؔ یہ تلخ گھونٹ غمِ جاوداں کے ہیں
ہے زہر سے امیدِ حیاتِ دوام، لے

(ستمبر، ۱۹۶۷ء)

◆◆

❁

دل پر ہے مہر لاکھ پیمبر اٹھا کریں
ہیں اپنے کان بند تو محشر اٹھا کریں

باہر وہ گونج ہے کہ ٹھہرتے نہیں حواس
کتنے ہی شور سینے کے اندر اُٹھا کریں

بازارِ ہوش میں درم و دام سے ہے کام
سودا کہاں ہے سر میں جو پتھر اٹھا کریں

یہ زندگی پہاڑ سی کب تک لیے پھریں
تیشے کبھی تو سنگِ گراں پر اٹھا کریں

مقسوم یہ ہوا کہ فقیری ہمیں ملے
اور ان کی خاک سے بھی تونگر اٹھا کریں

اکرام سارے ان کی ہی دستار کے لیے
الزام سب ہمارے ہی سر پر اٹھا کریں

کیا خوب جگمگاتی ہے دکانِ شیشہ گر
کیا ہو مقابلے میں جو پتھر اٹھا کریں

در پیش ہیں جو خاک نشینوں کو مسئلے
یہ بھی کبھی تو برسرِ منبر اٹھا کریں

کچھ لوگ بے زباں ہیں انھیں مسکرا کے دیکھ
ہاں دل گرفتگاں کے کبھی سَر اٹھا کریں

ہاں آفتیں چلیں تو نگاہوں کے ساتھ ساتھ
فتنے اٹھیں تو قد کے برابر اٹھا کریں

باقرؔ جمالِ خوش نظراں لفظ میں سمیٹ
کاغذ پہ بھی خیال کے پیکر اٹھا کریں

(ستمبر ۱۹۶۷ء)

جادو تری نظر کے مرے مدعا کے تھے
حیلے گھٹا کے تھے تو حوالے ہوا کے تھے

ملتے کہاں جو اہلِ چمن ڈھونڈتے ہمیں
آوارہ مثلِ نکہتِ گل ہم سدا کے تھے

اب راہِ دل میں بس تری یادوں کی دھند ہے
کل اس پہ کچھ نشان ترے نقشِ پا کے تھے

فطرت میں فن تھا فن میں تھی فطرت طلسمِ شوق
گرویدہ ہم جو شوخیِ رنگِ حنا کے تھے

وہ صرف سادگی تو نہ تھی جس پہ مر مٹے
اُس سادگی میں بھی کئی پہلو ادا کے تھے

ہشیار طرزِ کم نگہی سے نگاہِ یار
تیور کچھ آج اور ہی اہلِ وفا کے تھے

تیرے کرم کے باب میں کیا کچھ لکھا گیا
کتنے فقیر اور ہماری صدا کے تھے

اب طورِ دل کے واسطے لاؤ کوئی کلیم
یہ روشنی ہے اپنی وہ جلوے خدا کے تھے

باقرؔ کو آج بوئے وفا لے اُڑی کہیں
ہاں اے ہوائے دہر وہ سادے بلا کے تھے

(جنوری ۱۹۶۴ء)

سوئے ہوؤں میں خواب سے بیدار کون ہے
اس عالمِ خیال میں ہشیار کون ہے

مت پوچھ اس کا طالبِ دیدار کون ہے
یہ دیکھ مہر بر لبِ گفتار کون ہے

اُترا ہے چاند سینے میں یا خود ہی جل اُٹھے
تاریکیوں میں دل کی ضیا بار کون ہے

عرضِ ہنر میں کوہِ وفا پر ہو تیشہ زن
دے جان نذرِ شعلۂ اظہار، کون ہے

جو فن طرازیاں قد و گیسو کی بھانپ لے
جو جانچ لے قیامتِ رفتار کون ہے

سب اپنے اپنے دار و رسن ساتھ لے چلو
پوچھیں گے وہ کہ تم میں وفادار کون ہے

کچھ لوگ اپنے خوں میں نہا کر چلے گئے
اب سرخروئے عرصۂ پیکار کون ہے

دو گام دل کی راہ پہ چلنا محال ہے
اب اور ایسی وادیِ پُرخار کون ہے

پتھر سے آگ، آگ سے جولائے جوئے شیر
تم میں وہ تیشہ دارِ فسوں کار کون ہے

شاید کوئی چمکتا ہے سر چل کے دیکھیے
باقرؔ ہے، قیس ہے، پسِ دیوار کون ہے

(جولائی، ۱۹۶۰ء)

◆◆

دل خوں ہوا ہے شوخیِ رنگِ حنا کے ساتھ
ہے معنیِ بلند بھی طرزِ ادا کے ساتھ

چٹکا جو دل تو مثلِ گلِ تر بکھر گیا
خوشبو صبا کے ساتھ تھی نغمہ صدا کے ساتھ

یہ حال ہے چمن میں کہ اب مثلِ برگِ خشک
آوارہ ایک عمر سے ہیں ہم ہوا کے ساتھ

زُلفیں اُدھر کھلیں اِدھر آنسو اُمنڈ پڑے
ہیں سب کے اپنے اپنے روابط گھٹا کے ساتھ

تم رنگ تھے تو خوئے وفا تھی گلوں میں تھے
خوشبو بنے تو اُڑ گئے موجِ صبا کے ساتھ

آہٹ پہ کان راہ میں آنکھیں بچھی ہوئیں
ہم دور تک چلے تری آوازِ پا کے ساتھ

سنکی ہوا تو شورشِ زنداں بھی بڑھ گئی
دل وجد میں ہے نغمۂ زنجیرِ پا کے ساتھ

ہے انتہائے شوق بھی بے راہیوں کا باب
ہم تھوڑی دور چلتے ہیں ہر رہ نما کے ساتھ

آخر کو گرد ہو کے رہے مثلِ گرد باد
دو چار ہاتھ ہم بھی اُڑے تھے ہوا کے ساتھ

باقرؔ تمہارا شہر میں ضامن بنے گا کون
کچھ نقد بھی تو چاہیے جنسِ وفا کے ساتھ

(اکتوبر۱۹۶۳ء)

بنجر زمینِ دل ہے نہ ڈھونڈو وفا کے پھول
کانٹوں سے کب اُگاتے ہیں جھونکے ہوا کے پھول

اُن راستوں میں کاوشِ خارِ الم ملی
چنتے رہے ہیں لوگ جہاں مدعا کے پھول

دل چاک ہو تو صورتِ پیہنائے غم ہے اور
کلیوں کو دیکھیے کہ بنیں مسکرا کے پھول

دستِ ہوس دراز ہیں اے رہروانِ شوق
برسا رہے ہیں آج وہ پتھر دکھا کے پھول

ہر زخم ہے نمونۂ گل کاریِ کمال
گلیوں میں خاک اڑائیے دل میں سجا کے پھول

یارانِ نکتہ سنج بھریں دامنِ خیال
صحنِ غزل میں کھل گئے میری نوا کے پھول

کیا کیا کھلے ہیں نشۂ صہبائے رنگ سے
یہ گل بدن ہیں نکہتِ موجِ صبا کے پھول

برقِ نظارہ سوز جو ٹھہرے تو دیکھیے
آنکھوں کی چاندنی میں کھلیں گے حیا کے پھول

باقرؔ ترے فسونِ معطّر کی خیر ہو
وہ گلعذار، سحر ہیں جس کی قبا کے پھول

(اکتوبر ۱۹۶۲ء)

آنکھوں سے سیلِ اشکِ رواں کا نکاس ہے
کچھ منہ سے بول خندۂ لب کتنی پیاس ہے

کچھ اور دل کو جز تپشِ غم نہ چاہیے
صحرا کو آفتاب کی حدّت ہی راس ہے

یہ بھی نہیں ہے ہوش کہ خود کو پکار لیں
ہر سمت ایک شورِ شکستِ حواس ہے

کیا راہ دیکھتے ہو وہ دیوار کھنچ گئی
کیوں چونکتے ہو کون یہاں آس پاس ہے

ہاں رنگِ گل میں زخمِ جگر کا نمک سہی
خوشبو میں التفاتِ صبا کی مٹھاس ہے

امید سے ہے خوف، گزر موجِ بحرِ زیست
ہم ڈوبتوں کی آس بھی تنکے کی آس ہے

وہ ٹھیکرا جو راہ کی ٹھوکر میں ہو پلا
ہو لاکھ بے اساس حوادث شناس ہے

تھے تشنہ لب سرابِ تمنّا میں گھر گئے
اب ہم ہیں، ریگِ یاس ہے، دشتِ ہراس ہے

باقرؔ جنوں کے نام خرد کا سلام بھیج
اب ذکرِ پیرہن ہے نہ فکرِ لباس ہے

(جولائی،۱۹۶۱ء)

◆◆

دل بھی وہیں ٹھہر گیا جا کر نظر تو کیا
اب جستجوئے خوب ہو یا خوب تر تو کیا

ہے خوف سے اُمید کا رشتہ یہی سہی
اب راہزن ہی ڈھونڈ نہیں راہبر تو کیا

گزری اک عمر یاں سفرِ انتظار میں
ڈھونڈا اُسے کسی نے پہر دو پہر تو کیا

خود راستے بھی خاک اڑاتے ہیں میرے ساتھ
میرے سفر میں تُو نہ ہوا ہم سفر تو کیا

کل تک تو اپنے قصرِ تمنا کی دھوم تھی
واماندگی میں آج ہوئے در بدر تو کیا

دل میں بسے جدائی کے لمحوں کی لو بھی دیکھ
دھندلے سے آسرے پہ جیا عمر بھر تو کیا

کتنے ہرے درخت تھے جو لُو سے جل گئے
ہاں اب گھٹائیں ٹوٹ کے برسیں اگر تو کیا

آخر سب اپنی اپنی سنا کر ہوئے خموش
تھی داستاں طویل تو کیا مختصر تو کیا

گونگوں سے کب متاعِ سخن کی ملی ہے داد
یارو گداگروں میں لٹائے گہر تو کیا

اندھوں کے آگے فن کے جلائے دیے تو پھر
بہروں کے آگے کیجیے عرضِ ہنر تو کیا

اس دور میں کہ بے ہنری کو ہے سروری
باقرؔ ترا کلام ہوا معتبر تو کیا

(جولائی ۱۹۶۴ء)

◆◆

یہ گونج ہے طلسمِ ہوا پر نہ جائیے
مت چونکیے خود اپنی صدا پر نہ جائیے

گلشن میں سیلِ نکہتِ غم کو بھی دیکھیے
اس گل بدن کی بوئے قبا پر نہ جائیے

ہاں یہ بھی دیکھیے کہ ہے کس سمت کی ہوا
طرزِ خرامِ موجِ صبا پر نہ جائیے

خود بھی تو جانچیے یہ نشیب و فرازِ راہ
یوں نقشِ پائے راہ نما پر نہ جائیے

دراصل پستیوں میں بلندی کی آن ہے
رکھیے قدم زمیں پہ ہوا پر نہ جائیے

یوسف ملیں تو چاہ میں رکھیے انھیں عزیز
یہ عہدِ گل ہے چاکِ قبا پر نہ جائیے

ہے اس کی بات بات میں اندازِ دلبری
ہاں یہ کہ صرف طرزِ ادا پر نہ جائیے

بدلے گا اپنی بات وہ رنگِ حنا کے ساتھ
اس بے وفا کے عہدِ وفا پر نہ جائیے

اُمڈا ہے سیلِ موسمِ گل پھٹ پڑا ہے دل
باقرؔ کی تند و تلخ نوا پر نہ جائیے

(جولائی، ۱۹۶۰ء)

◆◆

اس شہر میں ہے اب بھی وہ اگلا سا بانکپن
اب بھی وہی نکھار وہی رنگِ انجمن

کچھ کہہ رہی ہے کان میں یہ نرم ہوا
دل میں کھلا ہوا ہے تری یاد کا چمن

اب بھی مہک رہی ہے تری زلفِ عنبریں
اب بھی بہک رہی ہے تری بوئے پیرہن

ہاں وہ طلسم ریز تری چشمِ نیم خواب
ہاں وہ کرشمہ خیز ترا صندلیں بدن

ہاں وہ تری قیامتِ رفتار، ایک چال
ہاں وہ تری نزاکتِ گفتار ایک فن

تیری نظر کے گیت سناتی ہے چاندنی
تیری ہنسی کی بات بتاتی ہے ہر کرن

مریم صفت لکھیں تجھے وہ عصمتِ کمال
عیسیٰ نفس کہیں تجھے وہ خوشبوئے دہن

تیری ہوائے زلف لیے پھرتی ہے صبا
آوارہ تیرے واسطے ہیں سرو و یاسمن

اب تُو نہیں تو نقدِ دل و جاں کی قدر کیا
اس شہر میں ہیں قیس، نہ باقر، نہ کوہ کن

اب میں غریبِ شہر ہوں اے جانِ آرزو
اب میں وطن میں اپنے ہوں آوارۂ وطن

ہاں میں شریکِ رسمِ وفا کردگاں رہا
ہر گل سے زخم مانگے تو ہر خار سے چبھن

اب میں ہوں اور "ماتمِ یک شہرِ آرزو"
اب آرزوئے شہرِ وفا ہے مرا چلن

دل کے سیاہ خانے میں اے جانِ انجمن
روشن ہے تیرے نام سے اک مشعلِ سخن

(فروری، ۱۹۵۹ء)

◆◆

جادو وہ رنگ میں ہو کہ فن بولنے لگے
ایسی نوا کہ راہِ سخن بولنے لگے

اے عظمتِ کمالِ سخن دے مجھے وہ نطق
بولوں جو میں چمن کا چمن بولنے لگے

نکہت گلوں کی مثلِ معانی اُڑی پھرے
گویا ہو سرو، شاخِ سمن بولنے لگے

جادو جگائے لذّتِ تقریر کا اثر
گونگا بھی ہو کشادہ دہن بولنے لگے

باندھی صدائے تیشۂ فرہاد نے ہوا
وہ ضرب تھی کہ کوہ و دمن بولنے لگے

سَر تھے تو دار پر بھی اناالحق کا شور تھا
اب سَر نہیں تو دار و رسن بولنے لگے

میں اور شورشِ غمِ پنہاں خدا پناہ
ایسی گھٹن کہ تارِ بدن بولنے لگے

ہم طرز، ہم مزاج، ہم آواز اب کہاں
شہروں کو چپ لگی ہے تو بَن بولنے لگے

باقرؔ اب اپنے دور کی طرزِ نوا ہے اور
طوطی خموش زاغ و زغن بولنے لگے

(اپریل، ۱۹۶۳ء)

◆◆

باقرؔ فسونِ رنگِ طبیعت بھی دیکھیے
سر پر جنوں کا سایۂ رحمت بھی دیکھیے

گل کاریِ کمالِ جراحت بھی دیکھیے
دل میں ہر ایک پھول کی رنگت بھی دیکھیے

سینے میں پھر چھپایئے اندازِ بے رُخی
اک تیغِ بے اماں کی ہلاکت بھی دیکھیے

جو مل کے پھر جھکے تو نہ بھولے تمام عمر
وہ اِک نگاہِ لطف و مروّت بھی دیکھیے

ہے سرو یا تصورِ یک قامتِ جمال
اس شوخیِ خیال کی رفعت بھی دیکھیے

یعنی یقینِ فتنۂ دوراں بھی کیجیے
چلتی ہوئی زمیں پہ قیامت بھی دیکھیے

اس کی گلی سے لایئے ناکامیِ حیات
اس نامرادِ شوق کی ہمت بھی دیکھیے

پھر سے طوافِ کوئے ملامت کو جایئے
خود پر نگاہِ لطف کی تہمت بھی دیکھیے

سنیے طلسمِ رنگ صدا دے رہا ہے کیا
دوشِ صبا پہ موجۂ نکہت بھی دیکھیے

روشن ہوا جہان تو دل ہو گئے سیاہ
پردے میں عکسِ نور کے ظلمت بھی دیکھیے

سمٹیں جو تلخیاں تو مئے ناب بن گئیں
دو گھونٹ پی کے غم کی حلاوت بھی دیکھیے

باقرؔ سے مل کے آپ نے صورت تو دیکھ لی
اب دل میں آ کے حسنِ طبیعت بھی دیکھیے

(نومبر، ۱۹۵۷ء)

بے کیفیوں سے زیست کو تعبیر کر چکے
مشکل میں ہیں جو سہل کی تدبیر کر چکے

دل کا معاملہ نہ کھلا کچھ زبان سے
یوں ہم حضورِ یار بھی تقریر کر چکے

دو گام دل کی راہ پہ چل کر بھی دیکھیے
مانا مہ و نجوم کی تسخیر کر چکے

اس کا خیال خواب کی دنیا کی بات ہے
جو جاگتے ہیں خواب کی تعبیر کر چکے

تعمیرِ آشیاں کی ہوس دل میں رہ گئی
کتنے محل ہواؤں میں تعمیر کر چکے

بس ایک ہی جھلک پہ ہیں نازاں کہ آئینے
تسخیر ایک عالمِ تصویر کر چکے

ہر سمت بوئے زلف اُڑائے پھری صبا
دستِ ہوس ہواؤں کو زنجیر کر چکے

محفوظ ارضِ دل پہ نہیں ہے متاعِ ہوش
باقرؔ جنوں کے نام پہ جاگیر کر چکے

(اپریل ۱۹۶۱ء)

◆◆

شائستگیِ غم بھی ہمیں آ سکی نہ راس
آنسو پئیں تو اور بھڑکتی ہے دل کی پیاس

یہ شب ڈراؤنی ہے درِ دل نہ وا کرو
دزدیدہ پھر رہا ہے کوئی دل کے آس پاس

باندھو کہیں نہ رشتۂ لا حاصلِ وفا
رکھو کہیں نہ سلسلۂ شوق کی اساس

سودا نہیں تو وضعِ جنوں کیوں رکھیں عزیز
جز سنگِ صد ملامتِ دل کیا ہے اپنے پاس

عرضِ نیازِ شوق نہیں خود کشی سے کم
دیکھو کبھی زباں پہ نہ ہو حرفِ التماس

ہاں توڑ دو سلاسلِ غم ہائے بیدلی
ہاں کہہ دو اب نہیں ہمیں رسمِ وفا کا پاس

اے ساکنانِ کوئے طرب ان سے کچھ کہو
یہ لوگ پھر رہے ہیں یہاں کچھ اُداس اُداس

ہر اک تھا ان میں سروِ چراغانِ آرزو
ہر ایک بجھ گیا ہے بسانِ چراغِ یاس

یہ دن کی روشنی ہے مرے دل کی روشنی
ساری اندھیری رات مرے غم کا اقتباس

اب کس کو بولتی ہوئی تصویر دے صدا
صورت شناس لاکھ مگر کون دل شناس

شاید متاعِ شورشِ دل لٹ گئی کہیں
باقرؔ غریبِ شہر جو پھرتا ہے بدحواس

(جون، ۱۹۵۹ء)

◆◆

اخبار میں ہے زیست کے وسواس کی صدا
انسان کا ضمیر ہے قرطاس کی صدا

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے سنیے مآلِ دل
ہونٹوں سے کب نکلتی ہے احساس کی صدا

محفل میں سنیے شورِ طرب یا ندائے درد
انبوہ میں ہے شہر کے خنّاس کی صدا

گھیرے ہے چار سمت سے آواز شہر میں
باہر بسوں کی گھر میں ہے انفاس کی صدا

رہیے ابھی معاملۂ دل سے بے نیاز
امید سن کے ٹال گئی یاس کی صدا

ہوں بند دل کے کان تو اللہ کی ہے مہر
سنیے گزرتی جاتی ہے احساس کی صدا

کانوں کے در پہ آئی ہر آواز دور کی
الجھی ہوئی ہے ذہن میں ہر پاس کی صدا

میں شہرِ آہنی میں گھرا ہوں جنابِ خضر
سنتا ہوں قعرِ بحر سے الیاس کی صدا

کچھ کہہ کے اپنے آپ کو رسوا نہ کیجیے
سنیے بغور ذہن کے افلاس کی صدا

یوں چونک اٹھے ہیں حضرتِ باقرؔ کہ آج تک
جیسے کبھی سنی ہی نہیں آس کی صدا

(اگست،۱۹۶۰ء)

◆◆

باقر حسابِ سود و زیاں یوں نہ کھولیے
دنیا کو پہلے دل کی ترازو میں تولیے

ان راستوں میں جی کے زیاں کی خبر نہ تھی
کچھ لوگ جا رہے تھے سو ہم ساتھ ہو لیے

کچھ سامنے، گلوں کی تمنا نے رکھ دیے
کانٹے کچھ اپنی راہ میں خود ہم نے بو لیے

خود بھی نہ بک گئے ہوں متاعِ ہنر کے ساتھ
جیبیں سنبھالتے ہیں تو دل بھی ٹٹولیے

اس سال گھل گیا ہے ہواؤں میں زہر بھی
ہم التفاتِ موجِ صبا کو بھی رو لیے

سورج کھڑا ہے آنکھ ملانے کے واسطے
کیوں کسمسا رہے ہیں بہت آپ سو لیے

گلیوں میں رات شہر کے کتے بھی تھے خموش
اے مہرباں یہ راز ہے اس کو نہ کھولیے

بارے کسی طرح تو خلش آشنا رہے
پائے گلوں سے خار تو دل میں چبھو لیے

باقرؔ بھری بہار کا چرچا ہے ہر طرف
کیوں چپ ہیں آپ، آپ بھی کچھ منہ سے بولیے

(جنوری ۱۹۶۲ء)

◆◆

دل وشت ہے وفورِ تمنا غبار ہے
اے ابرِ نو امید ترا انتظار ہے

پھر استوار رابطۂ سنگ و سَر ہوا
پھر ان دنوں جنوں کو ہوا سازگار ہے

جاں دادگی کی رسم جگاؤ کہ آج کل
پھر ملتفت ہوائے سرِ رہ گزار ہے

ہر نکہتِ خیال اسیرِ ہوا ہوئی
ہر موجِ نور کم نگہی کی شکار ہے

روشن ضمیر، تیرہ نصیبی، خدا کی شان
اتنی سی اب حکایتِ لیل و نہار ہے

ہاں اے ہوائے دشت ادھر شہر میں بھی آ
محبوس کب سے نکہتِ گیسوئے یار ہے

کہیے تو کس طرح جو نہ کہیے تو کس طرح
عرضِ سخن میں لفظ بھی بے اعتبار ہے

لب بستہ دل کشادہ چمن میں گزاریے
یہ غنچگی کی رسم گلوں کا شعار ہے

باقرؔ غزل میں رمز و کنایہ بجا مگر
یہ احتیاط حرفِ تمنّا پہ بار ہے

(مارچ ۱۹۶۳ء)

◆◆

وہ ہے کہ موجِ بادِ صبا ہے ہمارے ساتھ
کوئی قدم ملا کے چلا ہے ہمارے ساتھ

گونجی ہوئی ہے ایک کھنک بج رہے ہیں کان
گویا شکستِ دل کی صدا ہے ہمارے ساتھ

آواز دے رہے ہیں درِ دل سے وسوسے
ہر گام ایک کوہِ ندا ہے ہمارے ساتھ

ہر گام پر ہوا میں بناتے ہیں اک محل
روحِ طلسمِ ہوش ربا ہے ہمارے ساتھ

اک محشرِ جمال سے کترا کے ہم چلے
اک محشرِ خیال چلا ہے ہمارے ساتھ

طے کر رہے ہیں راہ جو ہم پا شکستگاں
یادِ خرام و لغزشِ پا ہے ہمارے ساتھ

باقرؔ کسی کی بزم سے کس بے دلی سے ہم
اُٹھے تو ایک حشر اُٹھا ہے ہمارے ساتھ

(جون،۱۹۵۹ء)

◆◆

ہنگامِ شام صبح کے پیغام آئے ہیں
جلوے اسیرِ گردشِ ایام آئے ہیں

وہ چشمِ منتظر نہ وہ نظارۂ جمال
سائے سے رینگتے بہ لبِ بام آئے ہیں

ہر گام عرضِ شوق پہ پابندیاں ملیں
ہر سو نگاہِ شوق پہ الزام آئے ہیں

وہ حوصلے جو ٹوٹ گئے راہِ شوق میں
وہ حوصلے بھی دل کے بڑے کام آئے ہیں

ٹوٹے فسونِ شوق یہ وسوسے بھی جائیں
جو دل کے ساتھ سا... بہ ہر گام آئے ہیں

آخر کو طے کریں گے رہِ وادیِ وفا
جو لوگ کوئے شوق سے ناکام آئے ہیں

کب سے ہوائے دشتِ غریبی ہے منتظر
باقرؔ تمہارے نام بھی پیغام آئے ہیں

(جنوری،۱۹۶۰ء)

◆◆

لحنِ بہار و رقصِ صبا بھی شریک ہے
اس جشنِ گل میں کوئی مرا بھی شریک ہے

تنہا نہیں ہے نغمگیِ سازِ زندگی
اس میں شکستِ دل کی صدا بھی شریک ہے

اُس کی وفا میں نکہتِ گل ہے بسی ہوئی
میری طلب میں رنگِ ہوا بھی شریک ہے

میں مدعا پرست نہیں میرے عجز میں
طرزِ تپاکِ رسمِ وفا بھی شریک ہے

ہاں اہلِ ہوش دیکھ کے در سر جھکائیے
بندے کی بندگی میں خدا بھی شریک ہے

کچھ مجھ سے مل گیا ہے مزاجِ غمِ حیات
یعنی مری فنا میں بقا بھی شریک ہے

جو خونِ دل ہے سرخیِ مضمونِ کائنات
اُس خونِ دل میں رنگِ حنا بھی شریک ہے

ہاں تو بھی دیکھ لے تری بزمِ خیال میں
میں بھی شریک میری وفا بھی شریک ہے

باقرؔ بنا ہے کج کلہاں کا مزاج داں
کچھ اس میں اہلِ دل کی دعا بھی شریک ہے

(فروری،۱۹۶۱ء

◆◆

ہوتی رہی ہے رسمِ وفا یوں بھی استوار
کچھ آپ دور ہٹ گئے کچھ ہم سنبھل گئے

مضمونِ رسم و راہِ وفا ڈھونڈیے تو کیا
اب اضطرابِ شوق کے عنواں بدل گئے

گھبرا اُٹھے تھے تنگیِ قیدِ مکاں سے جو
جانے کہاں وہ درد کے مارے نکل گئے

تیری گلی کی خاک بھی سَر پر نہ پڑ سکی
یوں تیرے سر بلند وہاں سَر کے بل گئے

کیا معذرت کہاں کی پشیمانیاں وہاں
باقرؔ انھوں نے ٹال دیا تم بہل گئے

(دسمبر،۱۹۵۶ء)

مرے سفر کی حدیں ختم اب کہاں ہوں گی
کہ منزلیں بھی تو آخر رواں دواں ہوں گی

یہ فاصلے جو ابھی طے ہوئے ہیں کہتے ہیں
یہ قربتیں ترے احساس پر گراں ہوں گی

جو دن کو رنگ لگیں اور شب کو پھول بنیں
وہ صورتیں کہیں ہوں گی مگر کہاں ہوں گی

وہ ہاتھ روٹھ گئے اور وہ ساتھ چھوٹ گئے
کسے خبر تھی کہ اتنی جدائیاں ہوں گی

سنا تو تھا مگر اس رمز کو سمجھتے نہ تھے
کہ تیری خوش نگہی میں بھی تلخیاں ہوں گی

تلاش تھی گہرِ درد کی نہ جانتے تھے
کہ بحرِ دل میں وہ گہرائیاں کہاں ہوں گی

وہ آج انجمنِ عام بن کے جاگیں ہیں
وہ خلوتیں جو کبھی تیری رازداں ہوں گی

ہمارے دم سے ہے روشن دیارِ فکر و سخن
ہمارے بعد یہ گلیاں دھواں ہوں گی

یہ عہد وہ ہے کہ میری وفا کے قصوں میں
تری جفا کی حکایات بھی بیاں ہوں گی

چلے چلو کہ دیارِ خرد کے اُس جانب
سکوں کی چھاؤں میں خوابوں کی بستیاں ہوں گی

تو راہِ شوق میں تنہا نہیں ٹھہر باقرؔ
کہ تیرے ساتھ ابھی جگ ہنسائیاں ہوں گی

(اپریل ۱۹۶۵ء)

وہ گھر کے آیا گھٹاؤں کی تیرگی کی طرح
برس پڑا مرے آنگن میں چاندنی کی طرح

وہ جس کے واسطے اک حرفِ مدعا نہ ملا
اُتر گیا مرے سینے میں آگہی کی طرح

نظر بچا کے جسے دیکھتے تھے میرے حریف
سما گیا مری آنکھوں میں روشنی کی طرح

ہوا پہ جس کے قدم ہیں مثالِ نکہتِ گل
اسیر ہے مرے شعروں میں نغمگی کی طرح

مرا غزال کہ وحشت تھی جس کو سائے سے
لپٹ گیا مرے سینے سے آدمی کی طرح

مری نگاہ کو تُو اپنے آئینے میں بھی دیکھ
جمی ہے تیرے لبوں پر شگفتگی کی طرح

کہاں کے شعر کہاں کی غزل یہ ذہن کی رو
بکھر گئی مرے کاغذ پہ شاعری کی طرح

زباں کھلی ہے تو دل پھٹ پڑا ہے صورتِ گل
وگرنہ ہم بھی تھے گم آپ میں کلی کی طرح

لحد میں ذہن کی مدفون پیکرِ اوہام
مری رگوں میں مچلتے ہیں زندگی کی طرح

یہ دھوپ چھاؤں ہے دنیا کی خود مرا سایہ
مرے قریب سے گزرا ہے اجنبی کی طرح

غمِ زمانہ سے دل تنگ تھے بہت باقرؔ
سمٹ کے رہ گئے احساسِ بے کسی کی طرح

(فروری، ۱۹۶۳ء)

خود اپنے ذہن کی تصویر سے ملا دوں گا
تو دل میں آ، میں تجھے کیا سے کیا بنا دوں گا

تو میرے بخت کا ٹوٹا ہوا ستارہ سہی
مری نظر میں سما، میں تجھے ضیا دوں گا

چُنے ہیں دامنِ دل میں تری نگاہ کے پھول
انھیں بھی یاد کے گلدان میں سجا دوں گا

سمٹ گیا ہے مرے غم میں کائنات کا عکس
اس آئینے کو ابھی اور بھی جلا دوں گا

نوائے درد خموشی، صدائے درد سکوں
میں اپنی چپ سے ہر اک بام و در ہلا دوں گا

خود اپنی بے سروسامانیاں سمیٹ تو لوں
میں دشتِ درد تری وسعتیں بڑھا دوں گا

یہاں تو چھاؤں تمنا کی کھینچ لیتی ہے پاؤں
میں اب یہ ریت کی دیوار بھی گرا دوں گا

اُلجھ رہی ہیں اُمیدیں مرے نصیبوں سے
میں یہ دیے بھی سرِ شام ہی بجھا دوں گا

اندھیری رات میں سایہ بھی کھو گیا باقرؔ
اب اپنی ذات کو کس شے کا آسرا دوں گا

(اپریل،۱۹۶۳ء)

جو دل کی موت ہے نغموں کی زندگی بھی ہے
شکستِ غنچہ میں اک پھول کی ہنسی بھی ہے

جہاں جہاں ہیں غمِ جاں کی تیرگی کے نشاں
وہیں وہیں ترے ماتھے کی چاندنی بھی ہے

ترے حضور کہاں چارۂ قرار و شکیب
کہ میرے ساتھ مرے دل کی بے بسی بھی ہے

جہاں پہ بیٹھ گئے تھک کے رہروانِ طلب
اُسی نواح میں شاید تری گلی بھی ہے

نہ کھا فریب خودی باقرؔ اس گلی سے نہ آ
کہ ایسے ترک میں رازِ گرفتگی بھی ہے

(جولائی، ۱۹۵۷ء)

ظرفِ عالی ہوں کہ بھر کر بھی کبھی چھلکا نہیں
ہوں وہ دریا جو کناروں پر کبھی بہتا نہیں

ہوں وہ پیمانہ کہ محفل جس کو ہاتھوں ہاتھ لے
میں وہ نشہ ہوں جو سر چڑھ کر کبھی اُترا نہیں

کشتِ ہستی تو مجھے پہچان، تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں

خواب ہوں لیکن اگر تعبیر خود اپنی کروں
میں نہیں یا پھر مری دنیا کا یہ نقشہ نہیں

دوں کسے آواز، اپنے آپ کو کیسے جگاؤں
تو مرے دل میں تو ہے لیکن مری سنتا نہیں

اس فقیری میں بھی للچاتی ہے دنیا کی جھلک
میں کہوں کیسے کہ اس کے پاس سے گزرا نہیں

تھا ہواؤں میں مگر نیچی تھی کچھ ایسی اُڑان
میں یہ سمجھا دل پہ اُترے گا مگر اُترا نہیں

فاصلے قربت بنے اب قربتیں ہیں فاصلہ
وہ جو پہلو میں ہے میرے دھیان میں آتا نہیں

دیکھتے ہو تم جسے ہر آن میرے ساتھ ساتھ
وہ مری آشفتگی ہے، وہ مرا سایہ نہیں

عزتِ سادات ہے محفوظ باقرؔ میرے پاس
میں وہ عاشق ہوں جو اب تک شہر میں رسوا نہیں

(اپریل، ۱۹۶۷ء)

◆◆

لفظ جب کوئی نہ ہاتھ آیا معانی کے لیے
کیا مزے ہم نے زبانِ بے زبانی کے لیے

یہ دوراہا ہے چلو تم رنگ و بو کی کھوج میں
ہم چلے صحرائے دل کی باغبانی کے لیے

زندگی اپنی تھی گویا لمحۂ فرقت کا طول
کچھ مزے ہم نے بھی عمرِ جاودانی کے لیے

میں بھلا ٹھنڈی ہوا سے کیا اُلجھتا چپ رہا
پھول کی خوشبو بہت تھی سر گرانی کے لیے

ٹوٹ پڑتی تھیں گھٹائیں جن کی آنکھیں دیکھ کر
وہ بھری برسات میں ترسے ہیں پانی کے لیے

راکھ ارمانوں کی گیلی لکڑیاں احساس کی
ہم کو یہ ساماں ملے شعلہ بیانی کے لیے

شمع ہو فانوس سے باہر تو گل ہو جائے گی
بندشِ الفاظ مت توڑو معانی کے لیے

دو کنارے ہوں تو سیلِ زندگی دریا بنے
ایک حد لازم ہے پانی کی روانی کے لیے

آج کیوں چپ چپ ہو باقرؔ تم کبھی مشہور تھے
دوستوں یاروں میں اپنی خوش بیانی کے لیے

(فروری،۱۹۶۶ء)

زہر ان کے ہیں مرے دیکھے ہوئے بھالے ہوئے
یہ تو سب اپنے ہیں زیرِ آستیں پالے ہوئے

ان کے بھی موسم ہیں ان کے بھی نکل آئیں گے ڈنک
بے ضرر سے اب جو بیٹھے ہیں سپر ڈالے ہوئے

چاک سی کر جو ہرے موسم میں اٹھلاتے پھرے
خشک سالی میں وہ تیرے چاہنے والے ہوئے

بڑھ کے جو منظر دکھاتے تھے کبھی سیلاب کا
گھٹ کے وہ دریا زمیں پر رینگتے نالے ہوئے

کیسے کیسے ناگہانی حادثے لکھے گئے
یاد کے پیلے ورق کس کس طرح کالے ہوئے

کچھ اُداسی بن کے پھیلے اُس کے رخساروں کے گرد
کچھ سیہ بادل کے ٹکڑے چاند کے ہالے ہوئے

پہلے رو لیتے تھے اب گلیوں کے پھیروں کا ہے شغل
پہلے جو آنسو تھے اب وہ پاؤں کے چھالے ہوئے

چھلکی ہر موجِ بدن سے حسن کی دریا دلی
بوالہوس کم ظرف دو چلّو میں متوالے ہوئے

کھل گئے تو بوئے معنی ہر طرف اُڑتی پھری
بند ہو کر لفظ باقرؔ نطق پر تالے ہوئے

(جولائی ۱۹۶۴ء)

◆◆

بے دلی وہ ہے کہ مرنے کی تمنا بھی نہیں
اور جی لیں کسی امید پہ ایسا بھی نہیں

نہ کوئی سَر کو ہے سودا نہ کوئی سنگ سے لاگ
کوئی پوچھے تو کچھ ایسا غمِ دنیا بھی نہیں

وقت وہ ہے کہ جبیں لے کے کرو در کی تلاش
عجب آشفتہ سری ہے کہ تماشا بھی نہیں

اپنے آئینے میں خود اپنی ہی صورت ہوئی مسخ
مگر اس ٹوٹے ہوئے دل کا مداوا بھی نہیں

ہُو کا عالم ہے کوئی نعرۂ مستانہ حق
کیا تری بزمِ وفا میں کوئی اتنا بھی نہیں

لفظ و معنی میں نہیں ربط مگر ہائے امید
اس پہ بیٹھے ہیں کہ وہ ٹالنے والا بھی نہیں

بے خودی ہائے تمنا کہ نہ تھی فرصتِ وہم
بے کسی ہائے تماشا کہ کوئی تھا بھی نہیں

پھول بن کر جو مہکتا تھا کبھی دل کے قریب
خار بن کر کبھی پہلو میں کھٹکتا بھی نہیں

تم بھی کہلاتے ہو دامن کشِ دنیا باقرؔ
سچ تو یہ ہے تمھیں جینے کا سلیقہ بھی نہیں

(مئی ۱۹۶۱ء)

◆◆

کارِ وحشت میں بھی مجبور ہے انساں اب تک
ہاتھ اپنا ہے اور اپنا ہی گریباں اب تک

دھجیاں میرے گریباں کی اُڑی پھرتی ہیں
گونجتا ہے مرے نعروں سے بیاباں اب تک

کب سے میں کنجِ غمِ دل میں چھپا بیٹھا ہوں
یاد کرتی ہے مجھے شورشِ دوراں اب تک

میرے حصے میں بھی ہے دولتِ بیداریِ شب
اک خلش سی ہے متاعِ غمِ پنہاں اب تک

بت کدہ ٹوٹ کے کعبے کی بنا ڈال گیا
دل جو اُجڑا تو ہے اک عمر سے ویراں اب تک

تو گزر گاہِ تمنا میں تھا اک پرتوِ ماہ
میں اندھیروں میں بھٹکتا ہوں ہراساں اب تک

تو وہ سورج تھا کہ موسم کی نہ تھی تجھ کو خبر
میں ہوں آندھی میں چراغِ تہِ داماں اب تک

میرے احساس کی گرمی مرے دل کی برسات
سب رُتیں ہیں تری آنکھوں سے نمایاں اب تک

ایک صورت تھی جو آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں
ایک وحشت تھی جو رکھتی ہے پریشاں اب تک

چند یادیں ہیں مری زیست کا حاصل باقرؔ
انھیں یادوں کے سہارے ہوں غزل خواں اب تک

(اکتوبر ۱۹۶۴ء)

نہ ہو گر طبع رواں پھر بھی قلم اُٹھتے ہیں
کس قدر سخت زمینوں میں قدم اُٹھتے ہیں

جیسے کھینچے لیے جاتی ہو حیاتِ جاوید
یوں قدم اپنے سوئے راہِ عدم اُٹھتے ہیں

خواب میں پھوٹے ہیں کیا کیا نہ طرب کے سوتے
خشک لب سوئیں تو با دیدۂ نم اُٹھتے ہیں

ڈھونڈتی پھرتی ہے اب گردشِ دوراں ہم کو
ہم ترے سایۂ دیوار سے کم اُٹھتے ہیں

شاید اب راس ہمیں آ گئی ویرانیِ دل
سنتے ہیں جھوم کے پھر ابرِ کرم اُٹھتے ہیں

کوئی حیرانی کوئی نشہ کہ ہو دل کو فراغ
نام لے کر ترا اسکندر و جم اُٹھتے ہیں

ٹوٹتی آس بھی دیتی ہے سہارے باقرؔ
کوئی دیوار گرے دل کی تو ہم اُٹھتے ہیں

(مئی ۱۹۶۱ء)

◆◆

کیا ملا اے زندگی قانونِ فطرت سے مجھے
کچھ ملا بھی حق تو باطل کی وساطت سے مجھے

میرے مالک میں تکبّر سے نہیں ہوں سربلند
سر جھکا اتنا ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے

میں وہ عاشق ہوں کہ خود ہی چومتا ہوں اپنے ہاتھ
کب بھلا فرصت ملی اپنی رقابت سے مجھے

میں وہ ٹوٹا آئینہ ہوں آپ اپنے سامنے
جس میں ہول آتا ہے خود اپنی ہی صورت سے مجھے

میں وہ پتھر ہوں کہ جس میں دودھ کی نہریں بھی ہیں
تیشۂ فرہاد مت ٹھکرا حقارت سے مجھے

میں وہ عالم ہوں کہ ہر عالم ہے مجھ سے ہم کنار
تو ذرا پہچان خود اپنی شباہت سے مجھے

خارِ زارِ دشت میں ہوں اور تو سروِ چمن
تو بھلا کیوں ناپتا ہے اپنے قامت سے مجھے

میں وفاداری میں شرطِ استواری پوچھ لوں
آپ نادم ہوں تو گالی دیں خجالت سے مجھے

حیف کس کے آگے لفظوں کے دیے روشن کیے
کتنی امیدیں ہیں اندھوں کی بصارت سے مجھے

میں کہاں بیٹھوں کہ سائے بھی گریزاں مجھ سے ہیں
اب تو دیواریں بھی تکتی ہیں حقارت سے مجھے

میں گریباں چاک تاریکی میں کب تک منہ چھپاؤں
اب تو شرم آنے لگی اپنی ندامت سے مجھے

آتی ہیں وحشت سرائے دل سے آوازیں عجیب
دیکھتے ہیں اب تو ویرانے بھی حیرت سے مجھے

اب اگر کچھ بھی نہیں ہوتا تو شورِ حشر ہو
کم نہیں ہے اتنا سناٹا قیامت سے مجھے

کون ناصر میرا باقرؔ، کس کو میرا انتظار
کوئے گم نامی میں ہے کیا کام شہرت سے مجھے

(مئی ۱۹۶۲ء)

❁

سر میں شورِ جستجو دل میں ہوائے شوق ہے
ہم ہواؤں میں ہیں دنیا زیرِ پائے شوق ہے

ہر شکست اک روشنی ہر روشنی اک آرزو
ٹوٹتا تارہ بھی اک طرزِ نوائے شوق ہے

ہاں چمن والو خرامِ موجۂ گل دیکھنا
نشہ آور ان دنوں آب و ہوائے شوق ہے

نغمۂ گل سے گلِ نغمہ کا ہے اک رابطہ
وہ پیامِ شوق یہ ضبطِ صدائے شوق ہے

اب تو وہ شرطِ اناالحق بھی نہیں وسواس کیا
اب تو چپ بھی دل کی منزل میں ندائے شوق ہے

ٹوٹتی رنگت، بکھرتی نکہتیں، بجھتی فضا
ہائے کن نازک سہاروں پر بنائے شوق ہے

جامہ زیبی بھی نصیبوں سے ہے باقرؔ ہو کہ قیس
چست کیا لاغر تنوں پر یہ قبائے شوق ہے

(مارچ ۱۹۶۴ء)

◆◆

برف و ے تو اک سکونِ مختصر ہے دوستو
جو تپش اک عمر کی ہے عمر بھر ہے دوستو

نیند میں بھی ہے نگارِ آتشیں رُخ کا خیال
اس اندھیرے میں بھی اک رقصِ شرر ہے دوستو

سرد ہے گر دل تو گرمِ جستجو کیا ہوں گے ہم
موسمِ خوش آئے تو عزمِ سفر ہے دوستو

پائے ہمت کے لیے ہر آبلہ ہے حوصلہ
خارِ محرومی نشانِ رہ گزر ہے دوستو

نورِ عرفاں ذہن کی تاریکیوں میں خندہ زن
یوں بھی اک ہنگامۂ شام و سحر ہے دوستو

ہے یہ نیرنگِ حقیقت رنگ بھی آہنگ بھی
شرطِ یک گوشِ دل و ذوقِ نظر ہے دوستو

کون جو توڑے طلسمِ بابِ قصرِ آرزو
دیکھنا تم میں کوئی شوریدہ سَر ہے دوستو

چار دن ہیں وہ گُلِ غم ہوں کہ خارِ انبساط
پھر کوئی دم میں یہ قصہ مختصر ہے دوستو

حاصلِ علم و ہنر رنگینیٔ قلب و نظر
سب تمھارا ہے تمھارے نام پر ہے دوستو

باقرِؔ آشفتہ سَر بیگانۂ دیوار و در
جانے اب کس حال میں وہ بے خبر ہے دوستو

(دسمبر، ۱۹۵۸ء)

ہو کے راہِ تختیِ جاں سے نڈھال آنے لگے
تیرے کوچے پھر ترے آشفتہ حال آنے لگے

دیدنی ہے آخری نظارۂ اوجِ کمال
رنگ کھلتا ہے جو سورج پر زوال آنے لگے

ذہن کے تاریک گوشوں کو بسانے کے لیے
پھول سے چہرے سرِ بزمِ خیال آنے لگے

بول اُٹھنے کو ہے خاموشی ارے کچھ منہ سے بول
اب تو تصویروں کے لب پر بھی سوال آنے لگے

جب چلے تو گرد پیروں کے لیے زنجیر تھی
جب اُڑے تو سامنے آنکھوں کے جال آنے لگے

ذہن کی کروٹ نے بدلا وقت کے دھارے کا رُخ
بہہ کے الٹے کتنے روز و ماہ و سال آنے لگے

گردِ صحرا تو چھپا لیجو مجھے اس وقت جب
خشک سامانی میں فصلِ برشگال آنے لگے

بیٹھ باقرؔ رکھ کے اب اپنی زباں دانتوں کے بیچ
بزم میں احباب بہرِ قیل و قال آنے لگے

(جولائی ۱۹۶۱ء)

◆◆

عہدِ وفا سبک ہوا رنگِ وفا کے ساتھ ساتھ
روحِ سخن بدل گئی طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ

سَر میں لیے تری ہوا عازمِ شہرِ دل چلا
نکہتِ گل کے ہم رکاب موجِ صبا کے ساتھ ساتھ

ڈھنگ بدلتے جائیں گے رنگ مچلتے آئیں گے
لغزشِ پا کی طرز میں رنگِ حنا کے ساتھ ساتھ

ایک ترے خیال نے فکر کو پَر لگا دیے
ہم بھی ہواؤں میں رہے موجِ ہوا کے ساتھ ساتھ

تا یہ سفر حیات کا مقصدِ زندگی بنے
چاہیے مرکزِ نگاہ گردشِ پا کے ساتھ ساتھ

لذتِ ناامیدیِ شوق بھی مستقل تو ہو
ترکِ طلب بھی کیجیے ترکِ دعا کے ساتھ ساتھ

آپ ہی کہہ کے سنتے ہیں، آپ ہی سن کے ہنستے ہیں
اپنی ہی بازگشت ہیں اپنی صدا کے ساتھ ساتھ

حق بھی ہے مصلحت طلب رخ پہ ہوائے دہر کے
چلتے ہیں اب خدا پرست خلقِ خدا کے ساتھ ساتھ

باقرِ کم عیار کی قدر کہاں تھی زیست میں
اٹھ کے خموش چل دیا وہ بھی قضا کے ساتھ ساتھ

(فروری، ۱۹۶۶ء)

◆◆

ڈھونڈو جس کو وہ بے نشاں ہے
کہنے کو جہاں میں اک جہاں ہے

ویرانیِ دل کا ذکر ہی کیا
یہ ایک طویل داستاں ہے

کچھ کہہ تو رہی ہے شمع کی لَو
سمجھو یہ زبانِ بے زباں ہے

آئینے میں عکسِ ماہ رُخ ہے
یا سینۂ سنگ ضوفشاں ہے

پھر دل کو سکون مل رہا ہے
اے شورشِ درد تو کہاں ہے

اب زہرِ غمِ حیات پی لو
پھر لذّتِ عمرِ جاوداں ہے

اب اپنے جگر کے چاک سی لو
پھر دیکھو بہارِ کامراں ہے

سینے سے لگا کے اس کو رکھو
وہ مہر و وفا کا رازداں ہے

روٹھے تو مناؤ پیار کر لو
وہ دولتِ دل کا پاسباں ہے

اب خواب میں اس سے لو لگاؤ
سو جاؤ وہ آج مہرباں ہے

دریائے حیات موج زن ہے
باقرؔ تجھے ڈوبنا کہاں ہے

(مئی ۱۹۶۱ء)

لوگ کہتے ہیں کہ سب ساتھ چلے
ساتھ ہم تھے بھی تو کب ساتھ چلے

رہنما موجِ ہوا تھی اپنی
لے کے ہم راہِ طلب ساتھ چلے

نور کے ساتھ ہو سائے کا سفر
صبح کے سائے میں شب ساتھ چلے

پھول جھڑتے ہوں تو خوشبو میں ہو راگ
نغمۂ خندۂ لب ساتھ چلے

وقت کی ریت پہ لکھے گئے نام
حشمت و جاہ و نسب ساتھ چلے

کج کلہ آج شہانہ نکلے
نخوت و غیظ و غضب ساتھ چلے

ہم فقیرانہ جلو میں لے کر
کلفت و رنج و تعب ساتھ چلے

ہو سخن تلخ تو ہنس کر کہیے
بات کی بات ہو ڈھب ساتھ چلے

آپ باقرؔ کو دِوانہ لکھیے
نام چمکے تو لقب ساتھ چلے

(جولائی ۱۹۶۱ء)

بنجر دھرتی دکھ کی ہم نے سینچی ہے جب روئے
دن کو فصل کھڑی دیکھی گر رات کو آنسو بوئے

پیار کا مول بھی دے آئے ہیں درد کے سود کے ساتھ
اصل بھی آج چکا آئے تو لمبی تان کے سوئے

ہم بھی گیت کی مالا گوندھیں دکھ کے پھول چنیں
لیکن آنکھ نہ ہو تو پیارے دھاگا کون پروئے

من کی جوت جگاؤ یارو اپنی کھوج لگاؤ
کیوں دنیا کے پیچھے بھاگو، دنیا کس کی ہوئے

ہم نے اپنے پیار کے داغ کو روشن دل میں رکھا
تم نے اپنے دکھ کے دھبے گنگا جل میں دھوئے

باقرؔ صاحب رات کڑی ہے من کا دیپ جلاؤ
کیسے کیسے سنگی ساتھی اندھیارے میں کھوئے

(اپریل۱۹۶۳ء)

میں بھی جاگا ہوا بھی جاگی شور مچا برساتوں میں
دل میں چھپے چور آ جاتے ہیں باہر کالی راتوں میں

بجتے بجتے آنکھیں میری دل کا رنگ دکھائیں گی
رچتے رچتے خون بنے گی مہندی اس کے ہاتھوں میں

بادل روئے بجلی تڑپی ٹھنڈی سانس ہوا نے لی
اس کی مجھ کو، میری اس کو خبر ملی برساتوں میں

اک دن اس کو پیار کیا اب تک ہر سانس مہکتی ہے
کھلتے پھول تبسم جس کا خوشبو جس کی باتوں میں

مجنوں اور فرہاد کے جیسے عشق کے نمبردار گئے
آپ کی کیا گنتی ہے باقرؔ آپ بھلا کن کھاتوں میں

(جولائی ۱۹۶۲ء)

دل کی بساط پہ شاہ پیادے کتنی بار اتارو گے
اس بستی میں سب شاطر ہیں تم ہر بازی ہارو گے

پریم پجاری مندر مندر دل کی کتھا کیوں گاتے ہو
بت سارے پتھر ہیں پیارے سَر پتھر پہ مارو گے

دل میں کھینچ کے اُس کی صورت آج تو خوش خوش آئے ہو
کل سے اس میں رنگ بھرو گے کل سے نقش اُبھارو گے

سارے دن تو اس کی گلی میں آتے جاتے گزری ہے
اب بولو اب رات ہوئی ہے کیسے رات گزارو گے

پیار کی آنکھیں مند جائیں گی دل کا دیا بجھ جائے گا
کب تک لہو جلاؤ گے تم کب تک کاجل پارو گے

پاگل پن ہے گونج کے پیچھے بھاگتے پھرنا چاروں اور
اپنی صدائیں واپس لے لو یوں کس کس کو پکارو گے

جس کو داتا مان کے تم نے بھیک لگن کی مانگی ہے
اس نے بھی جو سلام کیا تو دامن کہاں پسارو گے

باقرؔ صاحب! مہا کوی ہو بڑے گرو کہلاتے ہو
اپنا دکھ سکھ بھول گئے تو کس کا حال سنوارو گے

کلی کلی اشکوں کی لڑیاں پھول پھول یہ کومل گیت
کس کی سیج سجائی باقرؔ کس کا روپ نکھارو گے

(جنوری، ۱۹۶۱ء)

◆◆

گلیاں جھانکیں سڑکیں چھانیں دل کی وحشت کم نہ ہوئی
آنکھ سے کتنا لاوا اُبلا تن کی حدّت کم نہ ہوئی

ڈھب سے پیار کیا ہے ہم نے اُس کے نام پہ چپ نہ ہوئے
شہر کے عزت داروں میں کچھ اپنی عزت کم نہ ہوئی

من دھن سب قربان کیا، اب سَر کا سودا باقی ہے
ہم تو بکے تھے اونے پونے پیار کی قیمت کم نہ ہوئی

جن نے اُجاڑی دل کی کھیتی اُن کی زمینیں ختم ہوئیں
ہم تو رئیس تھے شہرِ وفا کے اپنی ریاست کم نہ ہوئی

اب بھی اتنا تر و تازہ ہے جیسے اوّل دن کا ہو
واہ رے اپنی کاوشِ ناخن، زخم کی لذّت کم نہ ہوئی

باقؔر کو تم خوب سمجھ لو رنجش ہے یہ دکھاوے کی
یوں تم سے بیزار پھرے ہے دل سے چاہت کم نہ ہوئی

(اپریل،۱۹۵۹ء)

دنیا دنیا سیر سفر تھی شوق کی راہ تمام ہوئی
اُس بستی میں صبح ہوئی تھی اس بستی میں شام ہوئی

کیسی لہر ہے سرد ہوا کی سارے ٹھٹھرے بیٹھے ہیں
کل تک تو بس ہم چپ چپ تھے آج خموشی عام ہوئی

موسم بدلے دل کا سورج دکھ کی گھٹا میں ڈوب گیا
پیار کے لیل و نہار نہ پوچھو شام سے پہلے شام ہوئی

درد کی برکھا ٹوٹ کے برسی پھوٹ بہے پلکوں کے بند
اس بارش میں وضعِ وفا کی ہر کوشش ناکام ہوئی

ہلکی سی اک لہر تھی اب وہ طوفاں بن کر ابھری ہے
اک بے نام خلش تھی پہلے اب وہ تیرا نام ہوئی

تیرے سَر پر رات کی رانی مہک مہک کر پھول بنی
میرے سَر میں پھول کی خوشبو شورش کا پیغام ہوئی

چھوٹا سا وہ دل کا ٹکڑا کیا کیا فصلیں دیتا تھا
حیف قمارِ عشق کے کارن کیسی زمیں نیلام ہوئی

پہلے تو اک سایہ ابھرا، پھر سایہ تصویر بنا
اب وہ شکل مری دیوار پہ گویا نقشِ دوام ہوئی

اِک عمل کے دو پہلو آوازِ سلاسل جذب کی چپ
وہ بھی میرے نام ہوئی تھی یہ بھی میرے نام ہوئی

اہلِ ہنر کی دنیا طلبی شوقِ شہادت کیا کرتی
اک تلوار تھی عرضِ ہنر کی وہ بھی زیبِ نیام ہوئی

باقرؔ تم سیّد زادے ہو سَر کو اُٹھائے پھرنا کیا
شوق و طلب کی حجّتِ آخر، آخرکار تمام ہوئی

(جولائی، ۱۹۶۴ء)

دل میں پت جھڑ آنکھیں پتھر، دھوپ میں سائے سائے لوگ
مرجھائی مرجھائی اُمنگیں، سنولائے سنولائے لوگ

ذہن کے کالے پردوں پر کیا کیا تصویریں چلتی ہیں
جھکتی پلکیں، تنتے ابرو، شرمائے شرمائے لوگ

سینے میں جو بوجھ تھی لب تک آ کر ہلکی ہو ہی گئی
مدت تک جو بات چھپائی کہہ کے بہت پچھتائے لوگ

خون کو گردش، دل کو کاوش، آنکھ کو سوزش دینے کو
آنکھ کے رستے دل میں اُترے پھر رگ رگ میں سمائے لوگ

ایک وہی دل کا رونا ہے سو سو روپ دکھاتا ہے
باقرؔ و قیس بنے پھرتے ہیں کیا کیا حال بنائے لوگ

اپنے جب بیگانے ہوں تو بیگانے اپناتے ہیں
جان سے پیارے لوگ ڈسیں تو سکھ دیتے ہیں پرائے لوگ

باقرؔ صاحب دل کے کھنڈر میں ایک دیا تو جلنے دو
وہ بھی دن تھے جب اس گھر میں کس کس راہ سے آئے لوگ

(جون،۱۹۵۹ء)

◆◆

آگ سے ٹھنڈک کون نکالے، بِس سے امرت کون بنائے
پیار کرو کیوں اُس ناگن سے جس کے کاٹے لہر نہ آئے

زلف کی خوشبو کون چرائے آنکھ کا جادو کون جگائے
تن میں چور پپیہا بولے، من میں گھور گھٹا لہرائے

تنہائی میں روپ متی یوں جھجکے سمٹے بدن چرائے
جیسے بن میں کھلی چنبیلی پھر سے بند کلی بن جائے

ایک کلی کے مرجھانے سے باغ کا بندوبست تباہ
کیسے کیسے بندھن ٹوٹیں، خوشبو بکھرے رنگ اُڑ جائے

اس نگری سے جانے والے کیسے ہیں کس حال میں ہیں
کوئی تو آ کر اُس نگری سے آنکھوں دیکھا حال سنائے

اک لمحے کی آس پہ ہم نے ساری عمر گنوائی ہے
ساری عمر کا وہ اک لمحہ جو للچائے پاس نہ آئے

باقرؔ صاحب کیا بچپن ہے چھوڑو اس کو بھول بھی جاؤ
جو نظروں سے بات نہ پوچھے دھیان میں آ کر کیوں چونکائے

(مارچ ۱۹۵۹ء)

◆◆

اکثر بیٹھے تنہائی کی زلفیں ہم سلجھاتے ہیں
خود سے ایک کہانی کہہ کر پہروں جی بہلاتے ہیں

دل میں اک ویرانہ لے کر گلشن گلشن جاتے ہیں
آس لگا کر ہم پھولوں سے کیا کیا خاک اُڑاتے ہیں

میٹھی میٹھی ایک کسک ہے بھینی بھینی ایک مہک
دل میں چھالے پھوٹ رہے ہیں پھول سے کھلتے جاتے ہیں

بادل گویا دل والے ہیں ٹھیس لگی اور پھوٹ بہے
طوفاں بھی بن جاتے ہیں یہ موتی بھی برساتے ہیں

ہم بھی ہیں اس دیس کے باسی لیکن ہم کو پوچھے کون
وہ بھی ہیں جو تیری گلی کے نام سے رتبہ پاتے ہیں

کانٹے تو پھر کانٹے ٹھہرے کس کو ہوں گے ان سے گلے
لیکن یہ معصوم شگوفے، کیا کیا گل یہ کھلاتے ہیں

اُلجھے اُلجھے سے کچھ فقرے کچھ بے ربطی لفظوں کی
کھل کر بات کہاں کرتے ہیں باقر بات بناتے ہیں

(نومبر، ۱۹۵۷ء)

◆◆

جو مانگے بھی ہاتھ نہ آئے کیوں اس کا ارمان کرو
باقر صاحب تم بھی کچھ ہو کچھ اپنا بھی دھیان کرو

وہ تو وہ آخر اک دن تم اپنے ہاتھ نہ آؤ گے
دل کا روگ بُرا ہے پیارے جینے کا سامان کرو

جھوٹی قسم کی ایک گرہ سے اور بڑھے گی پیار کی ڈور
روز نیا اک بندھن باندھو روز نیا پیمان کرو

بجلی بادل چاند ستارے سرو صنوبر خوشبو راگ
میرے من بھائے کا یارو ذکر کسی عنوان کرو

خون جو پانی ہو نکلے تو فن ہے یہی اے ہم نفسو
قطرہ قطرہ اپنے لہو کا شعر کرو دیوان کرو

ریت کا ڈھیر بنے بیٹھے ہیں سرد ہوا کے رستے میں
اے صحرا کے تند بگولو ہم پر بھی احسان کرو

اُس سے ملو یہ دل نے کہا تھا پر باقرؔ یہ کس نے کہا
اس کی ایک نظر کے صدقے اپنا دین ایمان کرو

(دسمبر ۱۹۶۱ء)

◆◆

کوئی نہ اُٹھ کر پانی مانگے یارو دل کی مار نہ کھاؤ
پیار سے پتھر پوجا بہتر پوجو بھی سر بھی ٹکراؤ

بادل سے رو ایک جھڑی لو طوفاں کی وحشت بن جاؤ
نگری نگری موتی رولو بستی بستی خاک اُڑاؤ

دل کے اُجڑے کاشانوں کو فرزانو اب آؤ سجاؤ
کچھ رنگین تمنائیں لو کچھ موہوم سے خواب بناؤ

آس محل اب ایک کھنڈر ہے اُجڑی راہ نہ آؤ جاؤ
ارمانوں کے بھوت ملیں گے دل کا در اب مت کھڑکاؤ

شہر کا شور تو سو جائے گا گھر کے سناٹوں کو جگاؤ
صبح سے آخر پھرتے پھرتے رات ہوئی گھر واپس آؤ

سونپ کے اُس کا پیار اسی کو دامن جھاڑ کے اُٹھ بیٹھو
لیکن اب گھر تنہا لوٹو یاد بھی اس کی ساتھ نہ لاؤ

پیار کی بازی ختم ہوئی ہم کچھ ہارے کچھ جیت بھی آئے
جو جیتے وہ دل کا حصہ ڈستی ٹیس اور رِستے گھاؤ

اس سے رحم کی بھیک نہ مانگی یہ کردار کی عظمت تھی
اب جب سب کچھ کھو آئے ہو دیکھو خود پر رحم نہ کھاؤ

خود کو ٹھوکر مار کے آخر کیسے چکنا چور ہوئے
اب بھی وقت ہے ان ٹکڑوں کو چن کر کوئی چیز بناؤ

باقرؔ صاحب کیوں چپ چپ ہو یوں گھٹ گھٹ کر مرنا کیا
دیکھو اب جی گھبراتا ہے اک اچھی سی بات سناؤ

(جون، ۱۹۵۹ء)

◆◆

رات کی یہ دیوار بھی توڑو دن کے در کی تمنا میں
ہمت ہے تو کھینچ ملاؤ آج کا دن بھی فردا میں

اب لاہور کا گھور اندھیرا آنکھ میں اُترا آتا ہے
وہ بھی دن تھے جب روشن تھے دل اس کوئے تمنا میں

دل سے اپنے بنا کر رکھو سیل محبت اُمنڈا ہے
باقرؔ صاحب ٹھیک نہیں ہے بیر مگر سے دریا میں

(دسمبر ۱۹۶۲ء)

آنکھ سے دل کے سوتے ابلتے رہے ہوک اُٹھتی رہی اشک چلتے رہے
کتنی زرخیز تھی یہ زمیں عشق کی درد اگتے رہے زخم پھلتے رہے

یہ ہوا رنگ ہے وہ فضا رنگ ہے یہ تمنا وہ تیری ادا رنگ ہے
رنگ نے رنگ باندھے بہت عشق کے رنگ اُڑتے رہے دل بدلتے رہے

کتنے خوش رنگ آنکھوں میں رہتے گئے کتنے آہنگ کانوں میں بجتے گئے
پر وہ منظر جو دل میں مچلتے رہے پر وہ نغمے جو سینے میں پلتے رہے

گو مکانی حدیں دور کرتی گئیں ہم زمانی حدوں میں ہم آہنگ تھے
وہ بھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے روتا رہا ہم بھی ہر آن پہلو بدلتے رہے

میں اندھیروں کی دنیا میں روشن رہا میں اُجالوں کی دنیا میں مسکن رہا
جتنے سورج مرے دل میں جلتے رہے اُتنے سائے مرے ساتھ چلتے رہے

اے خردمند سن ہم بھی دو بھائی تھے وہ جو حاکم بنے ہم جو رسوا ہوئے
وہ اُدھر لعل و گوہر میں تلتے رہے ہم ادھر لعل و گوہر اُگلتے رہے

تیرے بعد ایسی ایسی ہوائیں چلیں منزلوں منزلوں راہ تاریک تھی
آس کے جو دیے تو نے روشن کیے آرزو کے شبستان میں جلتے رہے

ہائے وہ قافلے نکہت و نور کے ہائے یہ ولولے شوقِ مجبور کے
ہم سرِ رہ گزارِ طرب زار، دل پا شکستہ کھڑے ہاتھ ملتے رہے

وہ اُدھر زلفِ خم دار کے سلسلے وہ ادھر شوقِ بے دار کے مشغلے
تھی کوئی دھن جو راتیں سلجھتی رہیں تھا کوئی شغل جو دن بہلتے رہے

پوچھتے کیا ہو باقرؔ کے شام و سحر وہ بہت دل گرفتہ تھے پہلے مگر
بس کسی طور مر مر کے جیتے رہے بس کسی طور گر گر سنبھلتے رہے

(ستمبر، ۱۹۶۴ء)

◆◆

بکھرے بادل میں تنہائی کیسی لگتی ہے •
ملن کا موسم اور جدائی کیسی لگتی ہے

سُونے من کے تاروں سے جب باتیں ہوتی ہوں
دوجے آنگن کی شہنائی کیسی لگتی ہے

دل کی چوٹ ابھر آئے اور زخم ہرے ہو جائیں
یادوں کی چلتی پُروائی کیسی لگتی ہے

تم کو شہرِ خیال میں رہنا کیسا لگتا ہے
وہ بستی جو دل نے بسائی کیسی لگتی ہے

چڑھتے روپ کی سورج دیوتا اور بھی مان بڑھائیں
دھندلی آنکھوں کی بینائی کیسی لگتی ہے

• باقر صاحب کی یہ غزل "تیشۂ لفظ" کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔

جگ بیتے جب جگمگ یہ دل اس کی جوت سے تھا
اب جو وہ صورت پھر یاد آئی کیسی لگتی ہے

دل تو اپنا بھر بھر آئے نیت نہیں بھرے
عمر کا حاصل ایسی کمائی کیسی لگتی ہے

بچپن اور جوانی بوڑھی عمر کے درپے ہیں
تینوں زمانوں کی یک جائی کیسی لگتی ہے

باقرؔ ساری عمر گزاری کوئے ملامت میں
آخر عمر کی یہ رسوائی کیسی لگتی ہے

◆◆

جوئے معانی

انتساب

اماں کے نام

جنھوں نے بچپن میں مجھے رنگین قلم کھیلنے کو دیے

پیش لفظ

باقر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام تیشۂ لفظ آج سے بائیس برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچے میں مرحوم ناصر کاظمی نے باقر صاحب کی غزل کی تفہیم کے سلسلے میں جو سمت نمائی کی تھی آج بھی اس سے ہٹ کر چلنا بہت مشکل ہے کیونکہ آغاز سے لے کر اب تک باقر صاحب کے تنقیدی نظریے اور اُن کی غزل متوازی چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے تنقیدی نظریات میں گزشتہ بائیس برس سے کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ چنانچہ موضوعات کی سطح پر اُن کی غزل کا مزاج کم و بیش وہی ہے جو تیشۂ لفظ میں تھا۔ یعنی تخلیقی رویّوں پر زور، غیر تخلیقی صورت حال پر طنز یا اس کے خلاف احتجاج اور معاشرتی اقدار کا شعور۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہ لیا جائے کہ شاعر ارتقائی عمل سے گریزاں ہے کیونکہ نظریے اور عقیدے کی سطح پر ارتقا کی اصطلاح زیادہ ساتھ نہیں دیتی اور خصوصاً جب شاعر (اپنے شعری رویّوں میں) عقیدہ پرست ہو تو ارتقائی عمل کا مفہوم یہ بھی نکل سکتا ہے کہ شاعر عصری تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے عقائد میں تبدیلی کرتا آیا ہے۔ باقر صاحب کے پاس اس طرح کی ارتقائی شکل نظر نہیں آتی کیونکہ وہ اپنی شاعری کے آغاز میں ہی اُس طرح کے نظریہ پرست تھے جس طرح کے آج ہیں۔ نظریہ پرستی کے لفظ سے یہاں ایک اور طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باقر صاحب نے بحیثیت نقاد، شاعر سے زیادہ شہرت کمائی ہے اور جب شعر میں نظریہ پرستی کی بات ہوگی تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی

نکلے گا کہ انھوں نے اپنے تنقیدی نظریات اپنی شاعری میں بیان کر دیے ہیں۔ یہاں شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کے تعلق کے بارے میں مرحوم ناصر کاظمی کا جملہ دہراتا چلوں کہ ''جو لوگ شاعر کے کلام میں اس کے نظریات منظوم صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انھیں ذائقہ بنا دیتا ہے، شاعر کا مطالعہ اور اس کے نظریات خام لوہے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دمِ شمشیر بن کر اپنے جوہر دکھاتا ہے۔'' دوسری بات یہ بھی ہے کہ شاعر کے نظریات سے مراد محض اُس کے نظریاتِ شعری نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے بارے میں بحیثیت واحد متکلم فرد کے معاشرتی زندگی کی ایک اکائی کی حیثیت سے یا معاشرے کی مختلف متحارب قوتوں کے بیچ میں ایک فریق کی حیثیت سے اس کے جو نظریات اُس کی شاعری میں در آتے ہیں اُن کا بسا اوقات بحیثیت شعروادب کے نقاد کے اُس کے نظریات کے ساتھ ایسا براہِ راست تعلق بھی نہیں ہوتا۔ شعر میں اُس کے عقائد کی جزئیات کہیں کہیں تو اس کے عقائد شعری کا حصہ ہوتی ہیں کہیں اس کی توسیع اور کہیں ان دونوں سے ہٹ کر کچھ اور۔ مثلاً نقاد سجاد باقر رضوی کے نزدیک شاعر کا بنیادی مقصد معاشرے میں تخلیقی یا تہذیبی رویوں کی ترویج و اشاعت ہونا چاہیے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ شاعر کا اپنے معاشرے کے ساتھ مکالمہ جاری رہنا چاہیے کیونکہ ترویج و اشاعت کے لیے خطیب اور مخاطب دونوں میں ترسیل اور ابلاغ کی ڈور بڑی پختہ ہونی چاہیے۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ:

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد

یہاں اقبالؔ نے ترسیل پر زور دیا ہے کیونکہ فریاد اُس وقت اثر کرے گی جب اُسے سُنا جائے۔ گویا فریاد کا سُنا جانا پہلا مرحلہ ہے جہاں پر دوسرے مرحلے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ مقصود دوسرا مرحلہ ہی ہے یعنی فریاد کا اثر دکھانا۔ اب یہاں گڑبڑ یہ ہوگئی ہے کہ شاعر

سجاد باقر رضوی کے نزدیک فریاد کا سُنا جانا بنیادی مرحلہ نہیں بلکہ محض فریاد کرنا ہی بنیادی اور آخری مرحلہ ہے۔ تیشۂ لفظ کی پہلی غزل جس کو باقر صاحب اپنا شعری منشور بتاتے ہیں اس کا آخری مصرعہ یوں ہے:

میں شہرِ خموشاں میں ہوں اور نغمہ سرا ہوں

ظاہر ہے جب آپ اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ اس دیار میں آپ کی زبان کو سمجھنے والا کوئی نہیں تو حضرت آتشؔ کے حساب سے آپ کی داستاں آپ کے دل میں نگفتہ رہ جائے گی اب اگر شاعر سجاد باقر رضوی، نقاد سجاد باقر رضوی کی پیروی کرے تو وہ یہی خیال کرے گا کہ بھائی شہرِ خموشاں میں فریاد کا یا دوسرے لفظوں میں نغمہ سرائی کا کیا فائدہ چلو کوئی زندہ انسانوں کا گروہ تلاش کرو اور انھیں اپنا پیغام دو۔ یہاں شاعر نے نقاد کی تھوڑی سی توسیع کی یا اس سے تھوڑا سا انحراف کیا اور یہی مناسب خیال کیا کہ میرا منصب نغمہ سرائی کرنا ہے اگر کوئی سننے والا نہیں، تو بھی۔

میں نے یہ ساری بات محض ایک چھوٹے سے نکتے کو سمجھنے کے لیے کی ہے ورنہ نہ تو یہاں کوئی گڑ بڑ واقع ہوتی ہے نہ اپنے نظریے سے انحراف کا کوئی گھمبیر مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے زورِ خطابت کو باقر صاحب کی شاعری کا جزوِ اعظم بتایا تھا یہ بات جزوی طور پر درست تھی لیکن گھپلا یہ ہوگیا کہ باقر صاحب کی شاعری کو محض زورِ خطابت کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ باقر صاحب مشاعروں میں گھن گرج کے ساتھ اپنی غزل سناتے تھے اور مرحوم ناصرؔ کاظمی کے ساتھ ساتھ ہم جیسے نوعمر سامعین کو بھی اُن کا زورِ خطابت لطف دیتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی باقر صاحب نے شاعری کے ساتھ ساتھ کچھ اور روگ بھی پال رکھے تھے لیکن اب چونکہ باقر صاحب کی عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ روگ بھی پختہ تر ہوگئے ہیں، اُن کا وہ زورِ خطابت بہت متاثر ہوا ہے۔ اب ہماری مجبوری یہ ٹھہری ہے کہ ہم باقر صاحب کے اشعار کو باقر صاحب کی آواز کے اتار چڑھاؤ کے حوالے سے

دیکھنے یا سننے کی کوشش نہ کریں۔ یوں تو آپ مایوسی کے عالم کی خودکلامی کو اپنے زورِ خطابت سے صلائے عام میں بدل سکتے ہیں۔ غالبؔ کے اُس مصرعے کی طرح کہ:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

اب خدا بھلا کرے غالبؔ کا کہ وہ ہمیں خود ہی بتا گئے کہ یہ بیک وقت صلائے عام بھی ہے اور مایوسی کے عالم کی خودکلامی بھی۔ اب تیشۂ لفظ میں شامل باقر صاحب کی ایک غزل کے دو اشعار دیکھیے جنھیں مرحوم کاظمی نے اپنے دیباچے میں بھی نقل کیا تھا:

کیا ملا اے زندگی قانونِ فطرت سے مجھے
کچھ ملا بھی حق تو باطل کی وساطت سے مجھے
میرے مالک، میں تکبّر سے نہیں ہوں سربلند
سر جھکا اتنا، ہوئی نفرت اطاعت سے مجھے

اب میری یہ مجبوری ہے کہ مجھے ان دونوں اشعار میں نہ تو زورِ خطابت نظر آتا ہے نہ ان میں احتجاج کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ جب آپ کی مخاطب زندگی ہو تو آپ زورِ خطابت کے ساتھ احتجاج کے مقام پر کھڑے ہی نہیں ہو سکتے یا پھر دوسرے شعر میں بھی جہاں شاعر کا مخاطب مالک دو جہاں ہے بغاوت یا احتجاج کے بجائے وضاحت یا معذرت خواہی کا انداز نظر آتا ہے خدا کو زورِ خطابت دکھانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

ناصرؔ کاظمی نے لکھا تھا کہ ''باقر صاحب، معاشرے کے شاعر ہیں۔'' نیز یہ کہ ''باقر صاحب کی غزل میں آدمی فطرت کی تمام چیزوں پر حاوی ہے۔'' مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ باقر صاحب معاشرے کے حوالے سے فرد کو دیکھتے ہیں اور فرد کے حوالے سے فطرت کو۔ حتیٰ کہ جہاں فطرت انسان پر حاوی ہے وہاں بھی بنیادی حوالہ انسان کا ہے نہ کہ فطرت کا۔ اور جہاں جہاں باقر صاحب کی غزل میں واحد متکلم کا صیغہ نظر آتا ہے وہ بھی فرد

کو دیکھنے کا حوالہ ہے اور شاعر نے یہ کام اتنی کثرت کے ساتھ کیا ہے کہ اس ایک سطح پر وہ میر کے بہت قریب نظر آتا ہے یہاں میں ایک مرتبہ باقر صاحب کے ان ناقدین سے معذرت طلب کروں گا جنھوں نے باقر صاحب کو غالب اور یگانہ کے درمیان گھمانے پھرانے کی کوشش کی ہے۔ رہا معاملہ یگانہ کا تو باقر صاحب کی ایک غزل کو چھوڑ کر (جو تیشۂ لفظ میں شامل ہے اور جس میں سے دو اشعار ناصر کاظمی نے بطور مثال اپنے دیباچے میں لکھے ہیں) باقر صاحب کی شاعری پر یگانہ کے اس نوع کے اثرات یقیناً نہیں ملتے کہ انھیں باقاعدہ پیرو یگانہ قرار دے دیا جائے۔ البتہ دونوں میں ایک ربط خفی ضرور موجود ہے اور یگانہ پر ہی کیا موقوف اُردو غزل کی روایت باقر صاحب کی غزل کے پس منظر میں موجود ہے۔ تیشۂ لفظ میں تو باقر صاحب کی غزلوں کی ایک معقول تعداد ایسی ہے جسے دیگر غزلوں سے الگ کر کے پیش کیا جائے تو باقر صاحب پر پیروی میر کا باقاعدہ شبہ ہو سکتا ہے۔ جیسے یگانہ کی چند معروف غزلوں کی بحروں میں غزلیں لکھنے کا مطلب پیروی یگانہ نہیں اسی طرح سے میر کے پسندیدہ آہنگ میں غزل لکھنے کا مطلب یوں تو پیروی میر بھی نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس آہنگ میں میر کا دامن چھڑا کر چلنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے:

بہتے بہتے آنکھیں میری دل کا رنگ دکھائیں گی
رچتے رچتے خون بنے گی مہندی اس کے ہاتھوں میں

بادل روئے، بجلی تڑپی، ٹھنڈی سانس ہوا نے لی
اس کی مجھ کو، میری اس کو خبر ملی برساتوں میں

اک دن اس کو پیار کیا، اب تک ہر سانس مہکتی ہے
کھلتے پھول تبسم جس کا، خوشبو جس کی باتوں میں

....

دل کی بساط پہ شاہ پیادے کتنی بار اُتارو گے
اس بستی میں سب شاطر ہیں تم ہر بازی ہارو گے
پریم پجاری مندر مندر دل کی کتھا کیوں گاتے ہو
بُت سارے پتھر ہیں پیارے سر پتھر پہ مارو گے
باقر صاحب مہا کوی ہو بڑے گرو کہلاتے ہو
اپنا دُکھ سکھ بھول گئے تو کس کا حال سنوارو گے

....

گلیاں جھانکیں، سڑکیں چھانیں دل کی وحشت کم نہ ہوئی
آنکھ سے کتنا لاوا اُبلا تن کی حدّت کم نہ ہوئی
ڈھب سے پیار کیا ہے ہم نے اُس کے نام پہ چپ نہ ہوئے
شہر کے عزت داروں میں کچھ اپنی عزت کم نہ ہوئی
باقر کو تم خوب سمجھ لو رنجش ہے یہ دکھاوے کی
یوں تم سے بیزار پھرے ہے دل سے چاہت کم نہ ہوئی

....

دنیا دنیا سیر سفر تھی شوق کی راہ تمام ہوئی
اس بستی میں صبح ہوئی تھی اس بستی میں شام ہوئی
ہلکی سی اک لہر تھی اب وہ طوفان بن کر ابھری ہے
اک بے نام خلش تھی پہلے اب وہ تیرا نام ہوئی
چھوٹا سا وہ دل کا ٹکڑا کیا کیا فصلیں دیتا تھا
حیف قمارِ عشق کے کارن کیسی زمیں نیلام ہوئی
باقر تم سیّد زادے ہو، سر کو اٹھائے پھرنا کیا
شوق و طلب کی حُجت آخر، آخرکار تمام ہوئی

ایک وہی دل کا رونا ہے سو سو روپ دکھاتا ہے
باقرؔ و قیس بنے پھرتے ہیں کیا کیا حال بنائے لوگ

اُس سے ملو یہ دل نے کہا تھا پر باقرؔ یہ کس نے کہا
اس کی ایک نظر کے صدقے اپنا دین ایمان کرو

اس بحر میں لکھی گئی غزلوں کے علاوہ تیشۂ لفظ کے ساتھ اس مجموعہ میں بھی باقرؔ صاحب کی غزلوں کی ایک بڑی تعداد ہندی مزاج کی غزلوں کی ہے جن میں یگانہؔ کی زہرناکی اور غالبؔ کی سرکشی پنپ نہیں سکتی۔ زیرِ نظر مجموعہ سے ایسے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خالی رہنے والا کیسہ اور بھر آنے والا دل
اپنا تو مقسوم یہی ہے اب آگے جو محبت دے

تو رازق ہے عالمین کا، دنیا کو دے سیم و زر
دل کے عالم پر بھی نظر رکھ ہم کو درد کی دولت دے

اہلِ ہوس کا حاصل دنیا، دنیا کا حاصل ہے ہوس
اے غمِ دل ہم اہل ہیں تیرے، جو کچھ تیری عنایت دے

اس کی اک تصویر بنا لوں دل کے صورت خانے میں
یادوں سے کچھ رنگ نچوڑوں اے غمِ دنیا مہلت دے

آس کی ڈور بہت نازک تھی بوجھ پڑا تو ٹوٹ گئی
تیز ہوائیں جب چلتی ہوں اُونچی پینچ لڑاؤ کیوں

ساری رتیں آتی جاتی ہیں ہر رُت کا ہے اپنا رنگ
رنگ کا دھوکا کھانے والو اپنا رنگ اڑاؤ کیوں

اب کے قمارِ عشق بھی ٹھہرا ایک ہنر دانائی کا
شوق بھی تھا اس کھیل کا ہم کو خوف بھی تھا رسوائی کا
بس وہی اک بے کیف اداسی، بس وہی بنجر سناٹا
سو سو رنگ ملن کے دیکھے، ایک ہی رنگ جدائی کا

....

پیار بھری نظروں کے ہنر سے حسن بھی رو بہ کمال ہوا
میری نظر سے خود کو جو دیکھا کیسا چہرہ لال ہوا

....

یوں بھی تھکن میں ایک دلاسا ملتا ہے
پیچھے دیکھو گردِ ملال ہے کتنی دور

....

بھاگ رہا ہے دریا بھی ساگر کی طرف
پیاس بجھانے والا خود پیاسا نکلا

آہنگ اور بحور کی بات چلی ہے تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہندی آہنگ کے ساتھ ساتھ فارسی کے چند اور آہنگ (جن میں رباعی کا آہنگ شامل ہے) کسی شاعر کو غالبؔ کے قریب ہونے کا موقع فراہم نہیں کر سکتے۔ باقر صاحب کے پاس اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے جو زیرِ نظر مجموعے سے منتخب کی گئی ہیں:

پردہ جو اٹھا حجاب دیکھا
کیا خواب میں ہم نے خواب دیکھا
رونق پہ دیارِ عشق کب تھا
ہر گھر کو یہاں خراب دیکھا

....

اُس شوخ سے ربط دل لگی کے
قربان خود اپنی سادگی کے
دنیا سے نباہ کا صلہ کیا
دیکھیں گے کچھ اور روز جی کے

....

صورت میں خیال ڈھونڈتا ہوں
انساں کی مثال ڈھونڈتا ہوں
جو کھوئے گئے رواروی میں
میں وہ مہ و سال ڈھونڈتا ہوں

....

مجھے دل میں رکھ مجھے پیار کر مجھے سُن میں تیرا نصیب ہوں
میں اسیرِ دل، میں سفیرِ غم میں نوائے صبحِ عجیب ہوں

....

اُسے میں تلاش کروں کہاں وہ عروج ہے میں زوال ہوں
غمِ مستقل مراحل کہاں، وہ جواب ہے میں سوال ہوں

....

تجھے میں ملوں تو کہاں ملوں، مرا تجھ سے ربط محال ہے
تری بزم، بزمِ نشاط ہے، مری بزم، بزمِ خیال ہے

....

یہی سنتے آئے ہیں ہم نشیں، کبھی عہدِ شوقِ کمال میں
کوئی شہر، شہرِ وفا بھی تھا اس سرزمینِ خیال میں

....

ہے دکانِ شوق بھری ہوئی، کوئی مہرباں ہو تو لے کے آ
زرِ داغِ دل کا سوال ہے کوئی نقدِ جاں ہو تو لے کے آ

جنھیں ناز ہے ترے پیار پر، وہ ہیں ریت رسم سے باخبر
کبھی عجزِ سجدۂ شوق ہے، کبھی کج جبیں پہ کلاہ ہے

بھلا اور کون ہو آشنا دمِ سرد کا، رُخِ زرد کا
تجھے سب خبر مرے دل کی ہے کہ تو عکس ریز ہے درد کا

شبِ غم سرک کہ میں اک نظر صفِ دشمناں کو تو دیکھ لوں
ابھی کتنے لوگ کمیں میں ہیں ابھی کتنے تیر کماں میں ہیں

عجب یہ ہے کہ اب اپنی حکایتِ غمِ دل
ہم اپنے آپ سے کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں

مجھے خوں بہا یہ ملا ہے میرے شباب کا
کہ زمینِ دل پہ کھلا ہے پھول گلاب کا

چلا ہے باقرؔ آج پھر دیارِ شوق کی طرف
وہی تو اک ٹھکانہ رہ گیا ہے میرے یار کا

یہاں اس نصابی امر کو دہرانے میں کوئی ہرج نہیں کہ ہیئت موضوع سے بالکل الگ کوئی شے نہیں۔ اپنے بیان کی وضاحت میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ غالبؔ جیسے عظیم شاعر کے پاس بحروں کا تنوع نہیں ملتا کیونکہ غالبؔ کے خاص موضوعات جس آہنگ کے ساتھ ربط رکھتے ہیں وہی غالبؔ کے پاس موجود ہے اس کے علاوہ غالبؔ نے جہاں اپنے مروّجہ آہنگ سے انحراف کیا ہے وہ خود اپنی روایت سے ہٹ کر میرؔ کی روایت کے قریب تر ہو گئے ہیں:

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

....

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

باقر صاحب بنیادی حیثیت میں اُردو شاعری کے استاد ہیں۔ یہاں میں نے استاد کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا کہ انھوں نے عمرِ عزیز کا بڑا حصہ یونیورسٹی میں پڑھا کر صرف کر دیا بلکہ ان معنوں میں کہ باقر صاحب نے اس سے بھی زیادہ وقت شاعری کے اسرار و رموز بیان کرنے میں صرف کیا جبکہ اُن کے مخاطبین اور سامعین صرف اُن کے شاگرد ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں ایک بڑی تعداد "غیر طالب علموں" کی ہوا کرتی تھی۔ ان کے طالب علموں میں بھی بہت کم ایسے تھے جنھیں باقر صاحب کی نگاہ التفات میں سے حصہ ملا اور ان طالب علموں میں بھی بہت کم ایسے تھے جنہوں نے کمرۂ درس میں باقر صاحب سے زیادہ کچھ سیکھا۔ یہ کام زیادہ تر یونیورسٹی کے اوقات میں اُن کے کمرے میں اور اس کے بعد کیفے ٹیریا، پھر لاہور کی سڑکوں اور اس کے بعد اُن کے گھر پر انجام پایا۔ سب سے اہم بات جو ماڈرن ازم کے اُس دور میں ہم نے اُن سے سیکھی وہ یہ تھی کہ محض نئے کپڑے پہن لینا کافی نہیں، نیا بننے کے لیے انسان کو اندر سے نیا بننا پڑتا ہے۔ گویا اس عہد کی معاشرت کی لفظیات کسی کو اس عہد کا شاعر نہیں بنا سکتی یہ وہ زمانہ تھا جب روایت پر

اعتقاد کے باوجود یہ بات دل میں کھٹکتی تھی کہ شاعری کا سکۂ رائج الوقت وہی لوگ ہیں جو باقر صاحب جیسا شعر نہیں کہتے اس طرح کا شعر کہنا ایک تو شاعر سے ریاضت کا طالب ہوتا ہے دوسرے اس کی پزیرائی بھی نہیں ہوتی۔ گویا یہ سراسر خسارے کا سودا ہوا۔ ہم نے باقر صاحب سے چھپ چھپا کر بڑی سہولت کے ساتھ سکۂ رائج الوقت قسم کی شاعری کی اور داد بھی پائی لیکن دل کو اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ یہ کھلا کہ شاعری کے موجود سامعین کی پسند کو سامنے رکھ کر شعر لکھنا آسان ضرور ہے لیکن اپنے مسئلے کا حل نہیں۔ مسئلے کا حل جبھی ممکن ہے جب شعر بھی اپنے ڈھب کا لکھا جائے اور سامعین بھی اسی ڈھب کے دستیاب ہوں۔ سامعین تو اس ڈھب کے دستیاب نہ تھے لے دے کے باقر صاحب ہی تھے جن کے در سے تھوڑی بہت ''حوصلہ افزائی نما داد'' مل سکتی تھی۔ وہ بھی دبے دبے لفظوں میں۔ ساتھ میں تھوڑی بہت سرزنش جو داد کی خوشی میں دب کر رہ جاتی تھی۔ باقر صاحب نے اس مشکل دور میں یہ مشکل کام کیا اور دوسروں کو بھی مائل کرنے میں ''صرف' ہوئے کہ روایت سے پیوست رہ کر ہی شاعر روایت کی توسیع یا اس میں نئے امکانات دریافت کرسکتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ شاعری کا مجدّدِ اعظم تو بن سکتا ہے، شاعر نہیں۔ باقر صاحب نے اس ریاضت میں خود کو بھی صرف کیا اور کسی حد تک اپنی شاعری کو بھی۔ اُن کا شعلہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں بھڑکا لیکن آج کتنے ہی چراغ اس اک چراغ کے روشن کیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ باقر صاحب بطور شاعر اُردو غزل کی روایت کے ساتھ اس مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کہ میرے خیال میں اُن کی غزل میں کسی ایک شاعر کا عمل دخل تلاش کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اُن کی غزل میں تو اُردو غزل کی پوری روایت بولتی ہے۔ ادب کا سنجیدہ قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ باقر صاحب اس طور سے پیروِ میرؔ نہیں ہیں کہ تعقّل اور منطقیت کا ہتھیار اُن کے پاس ہے۔ غالبؔ کے پیرو وہ اس انداز سے نہیں ہیں کہ غالبؔ کا ابہام جو شعر میں تہ داری پیدا کرتا ہے انہیں پسند نہیں ہے۔ یگانہؔ کا زہر خند باقر صاحب کے پاس مکمل طور پر آ ہی نہیں سکتا کہ یگانہؔ کے ساتھ اُس کے معاشرے نے جو سلوک کیا باقر صاحب اس سے صاف بچے رہے۔ یگانہؔ کی تلخ مزاجی، باقر صاحب کے

مزاج کے ساتھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتی کہ باقر صاحب تو اُن لوگوں کے ساتھ بھی کبھی تلخ نہیں ہوئے جنھیں خبر ہے کہ باقر صاحب کے دل میں اُن کے لیے تلخی موجود ہے۔ باقر صاحب پیروکار ہیں تو اردو کی شعری روایت کے جس میں سودا، میر، مصحفی، آتش، غالب، بہادر شاہ ظفر، حالی، اقبال اور یگانہ شامل ہیں۔ یہ سب آوازیں اس طور سے آپس میں ہم آہنگ ہوگئی ہیں کہ اس ترکیبی عمل نے شاعر سجاد باقر رضوی کو جنم دیا ہے۔ یہ شعر دیکھیے جن کا خالق اس شاعر کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا:

سیاہی دل کی پھوٹے گی تو پھر نس نس سے پھوٹے گی
غلامو، یہ نہ سمجھو داغ رسوائی جبیں تک ہے

....

وہ جن کے ہاتھ گرم تھے آواز نرم تھی
اے راستو گئے وہ مرے ہم سفر کہاں

....

رات کی چادر غنیمت، منہ لپیٹو سو رہو
دن کو چمکیں گی تمہارے سر پہ شمشیریں بہت

....

بس ایک گھونٹ محبت کا پی کے پچھتائے
تمام عمر وہ اک تلخ ذائقہ نہ گیا

....

گمان یہ تھا کہ بس دو قدم ہے اس کی گلی
قدم اٹھے تو یہی دو قدم چلا نہ گیا

....

پیار کی رُت ہے، مری آنکھوں کا منظر دیکھ لے
یہ سماں پھر ہو نہ ہو اب آنکھ بھر کر دیکھ لے

شہر سو جاتا ہے لیکن گونجتا رہتا ہے دل
اس ہجومِ یاد کو میں کیسے تنہائی کہوں

....

خالی رہنے والا کیسہ اور بھر آنے والا دل
اپنا تو مقسوم یہی ہے اب آگے جو مجت دے

....

ہوتی ہے ترے صبر سے بھی جبر کی تائید
کیوں پاؤں سکیڑے ہے یہ چادر ہی بدل دے

....

اے جذبِ شوق، سعیِ مکرّر دکھا مجھے
مت بے دلی سے ٹوٹے ہوئے پَر دکھا مجھے

....

ہیں سب کے تسلط میں نئے رُخ نئی راہیں
یہ کس نے کہا اپنا مقدر ہی بدل دے

باقر صاحب شعر کی زبان اور لفظیات کے معاملے میں روایت پر سختی سے کار بند ہیں لیکن وہ شعری زبان کی روایت جو نظیر اکبر آبادی سے اپنا سفر آغاز کرتی ہے اور موجودہ دور میں شاد عارفی، انجم رومانی اور ظفر اقبال کے پاس نظر آتی ہے، باقر صاحب اس سے بھی ایک سطح پر متاثر ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں اُن کی تین غزلیں اس مزاج کی حامل ہیں لیکن یہاں وہ سلیم احمد (بیاض) اور ظفر اقبال (گلافتاب) کی اینٹی غزل کی روایت سے بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں، انجم رومانی سے اُن کے مزاج کی مماثلت ان غزلوں میں اس حد تک ہے کہ انہوں نے اقدار کی پامالی اور معاشرے میں شر کی قوتوں کی بالادستی کی صورتِ حال پر طنز کو شعر کا موضوع بنایا ہے:

ذائقوں کے قتل کے یوں سلسلے جاری ہوئے
بوز نے اس عہد میں ادرک کے بیوپاری ہوئے

....

کوتاہ قدی کہتی ہے کھٹے ہیں یہ انگور
لیکن گہ و بے گاہ لپکتا بھی بہت ہے

....

یہ کیا کہ ساری عمر بہ طرزِ جنابِ شیخ
پگڑی سے اپنی علم کا طرّہ نکالیے

....

طاقت کے آگے گربۂ مسکیں کی میاؤں میاؤں
ناطاقتی کو دیکھ کے پنجہ نکالیے

باقر صاحب کے کل شعری سرمایے میں صرف تین غزلوں کا اس روایت میں ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ رنگ اور طرز باقر صاحب کے مزاج میں تو شامل ہے لیکن انھیں زیادہ مرغوب نہیں ہے اور غالباً یہ رنگ طنز کی اس شدت سے پیدا ہوا ہے جو ان غزلوں کی بنیاد ہے۔ سنجیدہ لہجے میں بات کی جائے تو طنز کا نشتر گہرا تو اُتر سکتا ہے، اُوپر نیچے اور دائیں بائیں زیادہ مار دھاڑ نہیں کرسکتا۔

آج کے دور میں جب سے ذرائع ابلاغ جمہوریت کا چوتھا ستون قرار پائے ہیں خود جمہوریت کی عمارت ڈانواں ڈول ہو گئی ہے کیونکہ ذرائع ابلاغ جمہوریت کا ماڈل دکھانے کے بھی ذمہ دار بن گئے ہیں۔ لیکن اس چوتھے ستون نے سب سے زیادہ نقصان ادب اور شعر کو پہنچایا ہے کیونکہ جس طرح تیسری دنیا کے جمہوری اداروں میں زوروزر والے قبضہ جمائے ہوئے ہیں اس طرح سے ذرائع ابلاغ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا میں اس نوع کا کاٹھ کباڑ ادب وشعر کا ماڈل بنا بیٹھا ہے۔ گویا ادب وشعر کے سنجیدہ طالب علم کے لیے بھی گمراہی کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے میں نے دورِ حاضر کے غزل گو شعر

کی مرتب شدہ کوئی ایسی فہرست نہیں دیکھی جس میں عزیز حامد مدنی اور سجاد باقر رضوی، دونوں کا نام شامل ہو۔ اسے ناقدریِ عالم کا گلہ نہ سمجھا جائے کہ باقر صاحب کے لیے ایک مقبولِ عام شاعر بننا شاید کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اُن کے پاس اس نوع کے وسائل یقیناً مہیا تھے۔ باقر صاحب نے تو اپنے لیے نسبتاً دشوار راستہ چنا۔ انہوں نے شعر کے استاد اور شاعر دونوں مناصب کو ساری عمر متوازی رکھا۔ بحیثیت استاد ذرائع ابلاغ اور ''مکتب'' کی پیدا کردہ گمراہیوں سے ادب کے سنجیدہ طالب علموں کو آگاہ و خبردار رکھنے کے ساتھ ساتھ بحیثیت شاعر اُن گمراہیوں سے بچنے میں اس قدر آگاہ و خبردار رہے کہ شاید اس قدر آگاہ و خبردار رہنا اُن کے لیے ضروری نہ تھا۔ اس گمراہی سے وہ شعوری طر پر اس قدر آگاہ و خبردار نہ رہتے تو اُن کا انفرادی رنگ شاید اور زیادہ نکھرتا۔ گویا، اُن کی راست روی اُن کے لیے کسی حد تک نقصان دہ بھی ثابت ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ ہمارا نقطۂ نظر ہے باقر صاحب کے نزدیک روایت کے ساتھ اس درجہ پیوست رہنے کی بات الزام کے بجائے اکرام کا درجہ رکھتی ہے۔ باقر صاحب نے یہ راستہ اس لیے بھی منتخب کیا کہ وہ شعر و ادب کے استاد تھے اور اس منصب کو شاعر کے منصب کے متوازی رکھنا چاہتے تھے باقر صاحب استاد ان معنوں میں نہیں کہ انہوں نے یونیورسٹی میں اُردو ادب کی تدریس کا کام کیا بلکہ ان معنوں میں کہ ان کا مشن اب تک شعر اور شاعری کی تفہیم کا رہا ہے۔ زندگی کی سطح پر بھی اور شعر کی سطح پر بھی کہ دونوں سطحیں اُن کے یہاں ایک ہیں:

مسافرانِ طلب میں شمار ہو کہ نہ ہو
چلے تو ہم بھی پسِ گردِ کارواں ہی سہی

محمد خالد

◆◆◆

بقدرِ حوصلہ کوئی کہیں، کوئی کہیں تک ہے
سفر میں راہ و منزل کا تعین بھی یہیں تک ہے

نہ ہو انکار تو اثبات کا پہلو بھی کیوں نکلے
مرے اصرار میں طاقت فقط تیری نہیں تک ہے

اُدھر وہ بات خوشبو کی طرح اُڑتی تھی گلیوں میں
اِدھر میں یہ سمجھتا تھا کہ میرے ہم نشیں تک ہے

نہیں کوتاہ دستی کا گلہ اتنا غنیمت ہے
پہنچ ہاتھوں کی اپنے، اپنے جیب و آستیں تک ہے

سیاہی دل کی پھوٹے گی تو پھر نس نس سے پھوٹے گی
غلامو، یہ نہ سمجھو داغِ رسوائی جبیں تک ہے

پھر آگے مرحلے طے ہو رہیں گے ہمتِ دل سے
جہاں تک روشنی ہے خوفِ تاریکی وہیں تک ہے

الٰہی بارشِ ابرِ کرم ہو فصل دونی ہو
کہ باقرؔ کی تو آمد بس اسی دل کی زمیں تک ہے

اب کے قمارِ عشق بھی ٹھہرا ایک ہنر دانائی کا
شوق بھی تھا اس کھیل کا ہم کو خوف بھی تھا رسوائی کا

بس وہی اک بے کیف اُداسی بس وہی بنجر سناٹا
سو سو رنگ ملن کے دیکھے ایک ہی رنگ جُدائی کا

پیار کی جنگ میں یارو ہم نے دو ہی خدشے دیکھے ہیں
پہلے پہل تھا خوفِ اسیری، اب ہے خوف رہائی کا

اپنی ہوا میں یوں پھرتا تھا جیسے بگولہ صحرا میں
ہم نے جب دیکھا تو عجب تھا حال ترے سودائی کا

اجنبی چہرے تکتے رہنا شہر کی چلتی راہوں پہ
اپنی سمجھ میں اب آیا ہے یہ پہلو تنہائی کا

آنکھیں اپنی بند تھیں جب تک حال پہ اپنے روئے بہت
آنکھ کھلی تو دیکھا حال یہی تھا ساری خدائی کا

دل کی زمیں پر بوئے تھے باقرؔ بیج جو درد جدائی کے
چلیے اب وہ فصل کھڑی ہے وقت آیا ہے کٹائی کا

◆◆

مل جائے گا کہیں نہ کہیں وہ مگر کہاں
وہمِ اُمید تجھ سے ملی ہے مفر کہاں

ہم بوئے گُل کے ساتھ تھے آوارہ ہو گئے
اے طالبانِ رنگ بھلا تُم اِدھر کہاں

دُنیا گئی تو اُس کی گلی میں جگہ ملی
پھر اِس کے بعد اے دلِ آشفتہ سر کہاں

ہر شکل آئینہ سی چمکتی دکھائی دے
ایسے میں ہو قرارِ شعاعِ نظر کہاں

تصویر کا سکوت ہے وہ ٹوٹ ہی نہ جائے
اے شورشِ نگاہ ٹھہر تو اُدھر کہاں

پل پل کی موت جوڑ کے کاٹی تمام عمر
اب خود سے پوچھتے ہیں جیے عمر بھر کہاں

وہ جن کے دن کی دُھوپ نگاہوں میں بس گئی
بول اے سیاہ رات بجھے وہ نگر کہاں

وہ جن کے ہاتھ گرم تھے آواز نرم تھی
اے راستو گئے وہ مرے ہمسفر کہاں

کھلتے تھے جس میں چپکے سے سرگوشیوں کے پھُول
اے شہر تجھ میں کھو گئی وہ رہگزر کہاں

بازارِ دل میں اپنی دُکاں ہم نے کھول لی
لاہور، تجھ کو حاجتِ جنسِ ہُنر کہاں

باقرؔ بھی ہو گا شہر کے شور و شغب میں گم
کیا اُس کو پوچھتے ہو مسافر کا گھر کہاں

◆◆

عقل نے کیں عشق کے عنوان پہ تقریریں بہت
دل جو مانے بھی تو اس کے پاس تعبیریں بہت

جب کلی چٹکی ہوا بھی پاس تھی وہ لے اُڑی
اس خبر کی ہیں کتابِ دل میں تفسیریں بہت

سر تو غیر اللہ کے آگے ہے خم اس کو نہ دیکھ
دل کی سُن یاں گونجتی رہتی ہیں تکبیریں یہاں

رات کی چادر غنیمت منہ لپیٹو سو رہو
دن کو چمکیں گی تمہارے سَر پہ شمشیریں بہت

اب جہانگیری تو ہے عدلِ جہانگیری کہاں
کوئی سُنتا ہی نہیں کھنچتی ہیں زنجیریں بہت

یُوں بسر کر سونے والے خواب کوئی دیکھ لے
شہر میں یوسف بہت ملتے ہیں تعبیریں بہت

ہے گھڑی عذرِ گنہ کی اہلِ قریہ جاگ اُٹھو
آخرِ شب کی دعاؤں میں ہیں تاثیریں بہت

تُو نے آنکھیں دیں تو آنسو دے کہ اِن میں بھر سکوں
رنگ آنکھوں میں نہیں، رہتی ہیں تصویریں بہت

دل بھی اِک تہذیب تھی اس کے کھنڈر بھی دیکھیے
اس خرابے میں ہوئیں مسمار تعمیریں بہت

یاد کے صفحات پر اب حاشیے لکھا کرو
پڑھ چکے باقرؔ کتابِ جاں کی تحریریں بہت

◆◆

ہزار شکر کبھی تیرا آسرا نہ گیا
مگر یہ ہے دلِ آدم کہ وسوسہ نہ گیا

وہ جب کہ زیست بھی اِک فن تھی وہ زمانہ گیا
اب ایک چیخ کہ اندازِ شاعرانہ گیا

بہت ہی شور تھا اہلِ جنوں کا پر اب کے
خرد سے آ کے کوئی زور آزما نہ گیا

چلی ہے اب کے برس وہ ہوائے موسمِ برف
دیارِ دل کی طرف کوئی قافلہ نہ گیا

بہت ہی سستی ہے بازارِ جاں میں جنسِ وفا
ارے یہ قحطِ طلب، دل کا کارخانہ گیا

مَیں توڑ توڑ کے خود کو بناتا رہتا ہوں
اب ایک عمر ہوئی پھر بھی بچپنا نہ گیا

بس ایک گھونٹ محبت کا پی کے پچھتائے
تمام عُمر وہ اِک تلخ ذائقہ نہ گیا

مَیں ایک برگِ خزاں دیدہ ہوں زمین کا بوجھ
ہوائے دہر ترے دوش پر اُڑا نہ گیا

برنگِ گُل رہے ہم بھی مزاج دانِ بہار
بس ایک بار ہنسے پھر کبھی ہنسا نہ گیا

کبھی بکھر گئے باتوں میں مثلِ نکہتِ گُل
کبھی کلی کی طرح مُنہ سے کچھ کہا نہ گیا

گمان یہ تھا کہ بس دو قدم ہے اُس کی گلی
قدم اُٹھے تو یہی دو قدم چلا نہ گیا

اب آؤ دن کی کہانی لکھیں کوئی باقرؔ
کہ رات ختم ہوئی، رات کا فسانہ گیا

◆◆

اندھیرے دن کی سفارت کو آئے ہیں اب کے
ہیں کتنی روشنیاں اشتہار میں شب کے

یہاں تو دیکھ لیے ہم نے حوصلے سب کے
ملے نہ دوست نہ دشمن ہی اپنے منصب کے

بس ایک بات پہ ناکامیوں نے گھیر لیا
زباں سے آئے لبوں تک نہ حرف مطلب کے

جو لب کشادہ تھے وہ مدعی بنے لیکن
جو دل کشادہ تھے وہ کام آ گئے سب کے

اِک آہِ خشک ہی اپنے نصیب میں نکلی
بہت ہی شور سُنے جذبۂ لبالب کے

جُدائیاں تو مقدر ہیں لیکن اے غمِ ہجر
عجیب پھول سے ساتھی بکھر گئے اب کے

بھٹک رہا ہے دیارِ خرد میں کیوں غمِ دل
گھروں کو لوٹ چکے سارے باوفا کب کے

زمینِ سخت میں لفظوں کے گُل کھلائے ہیں
غزل کہی تو ہوئے قائل اپنے کرتب کے

ہزار اُس نے بھی چکر دیے مگر باقرؔ
رہے نہ ہم بھی کبھی آسمان سے دَب کے

◆◆

تُو جبر کو ارادہ سمجھ، زچ نہ ہو سنبھل
اِس رُخ سے مات دہر کو دے اپنی چال چل

سب بندشوں کا کام ہے اِک روز ٹوٹنا
اے جذبِ دل کچھ اور تڑپ اور کچھ مچل

کب تک سنبھل سنبھل کے ہر اک وار روکنا
ہاں بڑھ کے ایک ضرب لگا پینترا بدل

کب تک چلے گی ساتھ خنک بادلوں کی چھاؤں
سورج نکل پڑا ہے ذرا اپنی آنکھ مل

اوروں کے واسطے ہی رہے روز و ماہ و سال
ہم کو تو ساری عُمر ملے آج اور کل

اپنی تو عمر صلح صفائی میں کٹ گئی
دل کو تھا اضطراب مگر عقل تھی اٹل

بدلا ہے کتنا رنگ زمانے نے تو بھی دیکھ
اے شوقِ نامراد کہیں تو بھی کچھ بدل

ہیں کیمیائے عشق کے یہ تجربے کٹھن
اے میرے دل کی آگ ابھی تھوڑی دیر جل

باقرؔ کبھی تو شوخ مضامیں سے دل لگا
بوجھل ہوئی ہے خشکیٔ افکار سے غزل

◆◆

پیار کی رُت ہے مری آنکھوں کا منظر دیکھ لے
یہ سماں پھر ہو نہ ہو اب آنکھ بھر کر دیکھ لے

میری نظروں کی کشش تیرے بدن کی زندگی
کیسا موجیں مارتا ہے یہ سمندر دیکھ لے

دیکھ کر تجھ کو پلٹ آیا ہوں اے آبِ بقا
مَیں بھی ہوں اپنے مقدر کا سکندر دیکھ لے

دل بڑھا اپنا اسے لا کر بٹھائے گا کہاں
پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھ لے

خواہشوں کے رنگ سے کیا کیا اُبھرتے ہیں خطوط
کھینچ کر اپنے تصوّر میں وہ پیکر دیکھ لے

اے زمانے کی سخن بیگانگی آ مجھ سے مل
تو بھی آخر ہے بلا تو بھی مرا گھر دیکھ لے

مَیں بگولہ بن کے رقصاں ہوں ہوا کی تھاپ پر
تو زمیں کی خاک بن جائے گا پتھر دیکھ لے

وہ تھرکتے ناچتے لمحے جو آئے تھے گئے
حاصلِ عمرِ گریزاں ہاتھ مل کر دیکھ لے

کون جانے کون ہے راہوں میں کس کا منتظر
اِک نظر دیکھا اُسے مُڑ کر مکرّر دیکھ لے

یہ ہوائیں اب کھلے پانی میں باقرؔ آئی ہیں
زور کتنا ہے اُٹھا کر تو بھی لنگر دیکھ لے

◆◆

تعزیرِ خود وسیلۂ تشہیر ہو گئی
دونی کلامِ شوق کی تاثیر ہو گئی

چاہا تو تھا کہ موجِ ہوا لے اُڑے کہیں
خوشبو کی لہر پاؤں کی زنجیر ہو گئی

سختی کشوں کو ہجر کا سادہ ورق تھی زیست
دل خوں ہوا تو عشق کی تحریر ہو گئی

آوارہ چاندنی کو دلوں میں سمیٹ لو
اوجِ فلک پہ چاند کی تسخیر ہو گئی

وہ چاند ہو کہ دل وہی بحرِ سکوت ہے
ویرانیٔ حسن و عشق کی تقدیر ہو گئی

جاں بخش ہے تو اس کو فسوں ساز کیوں کہو
مٹی تھی ارضِ پاک کی اکسیر ہو گئی

خواہش کے راگ، یاد کی خوشبو وفا کے رنگ
یکجا ہوئے تو لے تری تصویر ہو گئی

تعبیر کچھ دکھائیں حقیقت کے شعبدے
خوابوں میں قصرِ شوق کی تعمیر ہو گئی

دل میں دبی تو آہ بنی عدل کی طلب
دل سے اُٹھی تو نعرۂ تکبیر ہو گئی

لوحِ جبیں پہ خاکِ وطن مَیں نے نقش کی
چمکی تو وہ نوشتۂ تقدیر ہو گئی

باقرؔ یہ فصلِ درد ہے تُو اشکِ خوں سے سینچ
خوش ہو زمینِ غم تری جاگیر ہو گئی

امکاں طلبی زیست کی صحرا کے لیے ہے
دل کیوں در و دیوارِ تمنّا کے لیے ہے

صحرا میں بگولوں کا سماں باندھنے والے
کیا شغل مرے دیدۂ بینا کے لیے ہے

دریا پہ گھٹاؤں کو برستے ہوئے دیکھوں
منظر یہ مرے ذوقِ تماشا کے لیے ہے

آنکھوں کے لیے پیاس دلوں کے لیے وسواس
تحفہ یہ مرے عہدِ تمنّا کے لیے ہے

اَب رسمِ جنوں، راہِ طلب، بھول گئے سب
اَب صرف بگولہ ہے جو صحرا کے لیے ہے

دُنیا کے طلب گار نہیں ہم تو ہیں بے دین
دیں حضرتِ واعظ کا ہے، دنیا کے لیے ہے

اب قیس کو فرصت نہیں شوریدہ سری کی
اب گردِ سرِ راہ بھی لیلیٰ کے لیے ہے

عیسیٰ نفساں اب ہوئے اعجاز سے محروم
اَب تلخیِ آزار مسیحا کے لیے ہے

کوئی نہیں بازار میں یُوسف کا خریدار
تعبیر نئی خوابِ زُلیخا کے لیے ہے

اس سحر زدہ شہر میں پتھر ہوئے سب لوگ
اے خضر کوئی اسم جو احیا کے لیے ہے

باقرؔ کو نہ صحرا میں بکھیر اے مرے مالک
وہ خشک جزیرہ سہی دریا کے لیے ہے

◆◆

تُو رابطۂ شوق کو یکسر ہی بدل دے
آنکھیں تو نہ بدلیں گی یہ منظر ہی بدل دے

اس دورِ مسلسل میں کوئی طرح نئی ڈال
مے پر نہیں کچھ زور تو ساغر ہی بدل دے

ہیں سب کے تسلط میں نئے رُخ نئی راہیں
یہ کس نے کہا اپنا مقدر ہی بدل دے

مانا تری قسمت ہے طواف اس کی گلی کا
تھوڑی سی رہِ کوچۂ دلبر ہی بدل دے

یا گردشِ افکار بنے نغمۂ بیدار
یا اپنے خیالات کا محور ہی بدل دے

یہ کیا کہ وہی سنگ وہی شوق وہی سر
اے ذوقِ طلب راہ کے پتھر ہی بدل دے

ہوتی ہے ترے صبر سے بھی جبر کی تائید
کیوں پاؤں سکیڑے ہیں یہ چادر ہی بدل دے

جس گھر سے نہ صحرا کو نکلتی ہو کوئی راہ
اس خانۂ زنداں سے نکل گھر ہی بدل دے

ہو لفظ کی صورت میں تجلی کوئی باقر
یا جلوۂ معنی کا یہ پیکر ہی بدل دے

◆◆

اُڑ گئے سب رنگ یادوں کی فضا باقی نہیں
بجھ گئیں آنکھیں کہ خوابوں میں ضیا باقی نہیں

گونج سی پھرتی ہے یاں جیسے کوئی بے چین روح
دل کی بستی میں کوئی تازہ نوا باقی نہیں

خود سے ملنے میں بھی اِک لذّت تھی اب وہ بھی کہاں
شور اتنا ہے کہ چُپ کا بھی مزا باقی نہیں

پہلے تو اِک درد کا رشتہ تھا مل لیتے تھے لوگ
وہ بھی ٹوٹا اب دلوں میں رابطہ باقی نہیں

حاصلِ شوقِ سفر کیا ہے بجز رنجِ سفر
سر اَٹا ہے خاک میں اور نقشِ پا باقی، نہیں

ہم جو ہلکے تھے تو خود اپنی ہواؤں میں رہے
اب جو دل پر بوجھ ہے سَر میں ہوا باقی نہیں

بے دلی کی میں زباں ہوں بے زبانی کا ہوں دل
اب زبان و دل میں کوئی فاصلہ باقی نہیں

یا سرِ شوریدہ ٹوٹے یا گرے دیوارِ غم
بچ نکلنے کا تو کوئی راستہ باقی نہیں

زندگی نے ہم سے باقرؔ یوں چکایا ہے حساب
درد باقی رہ گیا درد آشنا باقی نہیں

◆◆

نمایاں اور بھی رُخ تیری بے رُخی میں رہے
سپُردگی کے بھی پہلو کشیدگی میں رہے

نظر اُٹھی تو اُٹھا شور اِک قیامت کا
نہ جانے کیسے یہ ہنگامے خامشی میں رہے

ہوائے شہرِ غریبی کی کیفیت تھی عجیب
نشے میں رہ کے بھی ہم اپنے آپ ہی میں رہے

پکارتے رہے کیا کیا نہ دل کے ویرانے
ہم ایسے شہر میں اُلجھے تھے شہر ہی میں رہے

حصارِ وحشتِ دل سے نکل تو آئے مگر
تمام عُمر عجب سحرِ آگہی میں رہے

مری وفا کی حقیقت غبارِ دشتِ طلب
مری وفا کے فسانے تری گلی میں رہے

کبھی تو پہنچے گی منزل پہ سر بلندیِ شوق
اس آسرے پہ مقاماتِ بندگی میں رہے

انھیں سے اُبھری ہیں کتنے غموں کی تصویریں
وہ سائے جو مری آنکھوں کی روشنی میں رہے

ہمیں ملا تھا شرف کائنات پر باقرؔ
ہمیں کلی کی طرح دل گرفتگی میں رہے

◆◆

اے جذبِ شوق سعیٔ مکرّر دکھا مجھے
مت بیدلی سے ٹوٹے ہوئے پَر دکھا مجھے

چہرے پہ بکھرے درد کے موتی سمیٹ لے
پلکیں اٹھا اتھاہ سمندر دکھا مجھے

اے حُسنِ تازہ خُو کوئی پیکر نظر فریب
اے شوقِ تازہ جُو کوئی منظر دکھا مجھے

اِک عمر اپنے آپ میں سمٹا رہا ہوں مَیں
کچھ روز اپنے آپ سے باہر دکھا مجھے

مَیں آئینہ نہیں کہ مکدّر رہا کروں
مَیں آدمی ہوں میرا مقدّر دکھا مجھے

ہاں میرے پاس کچھ بھی نہیں جز وفورِ شوق
تو کوئی چیز دل کے برابر دکھا مجھے

کب تک مجھے عزیز رہا امتحاں تو لے
اے دورِ بے حسی کوئی پتھر دکھا مجھے

اپنی جبیں کے تازہ لہو سے رقم کروں
تفسیرِ ضبطِ شوق کوئی در دکھا مجھے

سب کی بساط دیکھ چکا اپنی چال چل
باقرؔ کچھ اپنے کھیل کے جوہر دکھا مجھے

◆◆

خود جل کے اپنی آگ میں ہم کچھ تو کر گئے
وہ روشنی ہوئی کہ مناظر نکھر گئے

کچھ دَب کے ٹوٹ ٹوٹ گئے ضبطِ حال میں
کچھ لفظ آنسوؤں میں بہے اور بکھر گئے

اے میری نوشگفتہ کلی تو کھلی رہے
ہم تو ہوا کی لہر تھے آئے گزر گئے

صحرا کی پیاس دیکھ کے لب خشک ہو گئے
اِک آن میں چڑھے ہوئے دریا اُتر گئے

زُلفوں کی چھاؤں، آنکھوں کی ٹھنڈک، لبوں کے پھُول
اے عمر تو کہاں تھی وہ منظر بکھر گئے

بوتے تھے تیرہ راتوں میں جو روشنی کے بیج
اے صبحِ نو وہ تیرے طلب گار مر گئے

ہیں اس کے گرد شہر کے اہلِ ہوس تمام
اے ساکنانِ کوئے وفا تم کدھر گئے

پلکوں کی چھاؤں میں ہیں نہ صحرا کی دھوپ میں
مدّت ہوئی کہ اہلِ طلب اپنے گھر گئے

یہ شعبدے ہیں رنگِ تمنّا کے ہوشیار
باقرؔ حصارِ جاں میں کہاں تم ٹھہر گئے

◆◆

شہر کو توسیعِ صحرا سر کو سودائی کہوں
بے طلب پھرنے کو شوقِ آبلہ پائی کہوں

گونگے حرفوں کو زباں دیتا ہوں میں احساس کی
تم اِسے کارِ بغاوت، میں مسیحائی کہوں

دل تو وحشی ہے مگر وحشی بقیدِ رسم و راہ
خود کو میں قیدی کہوں یارو کہ سودائی کہوں

وہ تو اِک لمحے میں دل میں آ بسا میں کس طرح
عمر کے حاصل کو لمحے کی شناسائی کہوں

تو مری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو آنکھوں میں سما
کیوں مجھے ہر سُو دکھائی دے کہ ہرجائی کہوں

دیکھتا ہوں رات دن دل میں تمناؤں کے کھیل
تم کہو خود کو تماشا یا تماشائی کہوں

شہر سو جاتا ہے لیکن گونجتا رہتا ہے دل
اس ہجومِ یاد کو مَیں کیسے تنہائی کہوں

ہاں کبھی تو مجھ کو میرے ظرف کے شایاں بھی دے
بادِ پیمائی کو کب تک بادہ پیمائی کہوں

مَیں نے باقرؔ ایک ہی پہلو سے کھائی ہے شکست
دِل سے ہارا ہوں مگر کیوں اس کو پسپائی کہوں

◆◆

چاہت جی کا روگ ہے پیارے، جی کو روگ لگاؤ کیوں
جیسی کرنی ویسی بھرنی اب اس پر پچھتاؤ کیوں

سُرخ ہیں آنکھیں زرد ہے چہرہ رنگوں کی ترتیب عجیب
اس بے رنگ زمانے کو تم ایسے رنگ دکھاؤ کیوں

دل کا در کب بند ہوا ہے کوئی آئے کوئی جائے
جو آئے اور کبھی نہ جائے وہ مہمان بلاؤ کیوں

صبح کا بھولا شام کو واپس گھر آئے تو غنیمت ہے
جن گلیوں میں جا کے نہ لوٹو ان گلیوں میں جاؤ کیوں

آس کی ڈور بہت نازک تھی بوجھ پڑا تو ٹوٹ گئی
تیز ہوائیں جب چلتی ہوں اونچی پینچ لڑاؤ کیوں

ساری رُتیں آنی جانی ہیں ہر رُت کا ہے اپنا رنگ
رنگ کا دھوکا کھانے والو اپنا رنگ اُڑاؤ کیوں

آس کا دامن چھوٹ گیا تو ہاتھوں کو آزار نہ دو
اپنی چادر چھوٹی ہو تو پاؤں بہت پھیلاؤ کیوں

پیار کی شدّت دل کی حدّت باقرؔ اس کو راس نہیں
گرم ہوا کے جھونکوں سے اس پھول کو تم کملاؤ کیوں

◆◆

مجھے دل میں رکھ مجھے پیار کر مجھے سن میں تیرا نصیب ہوں
مَیں اسیرِ دل مَیں سفیرِ غم مَیں نوائے صبحِ عجیب ہوں

مجھے کیا جو شوق کی یہ گھڑی نئے موسموں سے ہے اجنبی
مجھے کام ذوقِ خرام سے، میں ہوائے شہرِ غریب ہوں

مَیں بلند ہوتا تو کس طرح مجھے پستیوں ہی سے کام تھا
مجھے کون سنتا مرے سوا، میں خلائے دل کا نقیب ہوں

مری قربتوں میں ہیں فاصلے، مرے فاصلوں میں ہیں قربتیں
ہوا جس کی آنکھ سے دور میں بس اُسی کے دل سے قریب ہوں

مجھے اہلِ دیں سے کلام کیا مری گفتگو کا مقام کیا
یہ خطاب اہلِ طلب سے ہے کہ میں شہرِ دل کا خطیب ہوں

ہے جو زہر میرے وجود کا، وہ ہے سحر میری نمود کا
مَیں نوائے نطقِ حکیم ہوں میں شفائے دستِ طبیب ہوں

مَیں ولی نہیں، مَیں نبی نہیں، یہ شرف بہت کہ ہوں آدمی
مَیں خود آپ اپنا عذاب ہوں، مَیں خود آپ اپنی صلیب ہوں

یہ عجب طلسم خیال ہے کہ شناخت اپنی محال ہے
کبھی گل زمینِ بہشت ہوں، کبھی ریگِ دشتِ مہیب ہوں

مجھے باقرؔ اپنی ہی آرزو، مجھے آپ اپنی ہی جستجو
مَیں کسی کا دوست بنوں تو کیا کہ میں آپ اپنا رقیب ہوں

◆◆

اُسے مَیں تلاش کہاں کروں وہ عروج ہے میں زوال ہوں
غمِ مستقل مراحل کہاں، وہ جواب ہے میں سوال ہوں

نئے موسموں کی ہوں آرزو، نئی رفعتوں کی ہوں جستجو
مجھے توڑ خوابِ جہانِ نو، مَیں طلسمِ بابِ خیال ہوں

مرے آئینے کی کدورتیں مری اپنی ذات کی گرد ہیں
مجھے کب ملال کسی سے ہو کہ مَیں آپ اپنا مآل ہوں

مری بندگی کے یہ مشغلے کہ خدائی سے بھی معاملے
کبھی خود ہی دستِ کریم ہوں کبھی خود ہی دستِ سوال ہوں

یہ بلند و پستِ جہانِ دل کہیں حوصلے کہیں مرحلے
کبھی ہوں میں اوجِ خیال پر، کبھی ضعفِ جاں سے نڈھال ہوں

کبھی کھل گئی جو کوئی کلی تو پیامِ شوق گلی گلی
کبھی آ گئی جو ہوائے غم تو میں گردِ بادِ ملال ہوں

کبھی مجھ سے سوزِ حیات لے، کبھی مجھ سے سازِ حیات سُن
مَیں فضائے قریۂ ہجر ہوں میں ہوائے شہرِ وصال ہوں

کبھی مَیں اسیرِ مکاں ہوا، کبھی ماورائے زماں ہوا
کبھی آج میں کبھی کل میں ہوں، میں عجیب صورت حال ہوں

کوئی اپنے آپ سے ہے مفر نہ ہوں اپنی ذات سے باخبر
مَیں تلاش اپنی کہاں کروں کہ مَیں آپ اپنی مثال ہوں

مَیں ہوں اپنی ذات میں خود چمن، میں ہوں باقرارِ نمو کا فن
کبھی غنچگی میں گرفتہ دل، کبھی جوشِ جاں سے نہال ہوں

◆◆

تجھے میں ملوں تو کہاں ملوں، مرا تجھ سے ربط محال ہے
تری بزم بزمِ نشاط ہے مری بزم بزمِ خیال ہے

ترا دل نہیں ترے ہاتھ میں مجھے دیکھ مَیں ہوں گرفتہ دل
مرا جبر میری نجات ہے یہ مرے ہنر کا کمال ہے

نہ تُو ہم زباں نہ تُو ہم زماں مرا تجھ سے کیسا معاملہ
مرا عہد عہدِ کمالِ غم، ترا عہد عہدِ زوال ہے

مَیں ہوں کم طلب تُو ہے کم نظر، مَیں نوائے دل تُو ہوائے دل
مری دسترس میں ہیں کل زماں، تو اسیر لمحۂ حال ہے

وہ ہے نقدِ زر تری آرزو، یہ ہے نقدِ دل مری آرزو
ترا نقد رزقِ حرام ہے، مرا نقد رزقِ حلال ہے

تری جستجو مری گمرہی تری انتہا مری ابتدا
تری زیست تیرا جواب ہے مری زیست میرا سوال ہے

تجھے کاروبار کو دن ملا مجھے کاہشِ شب غم ملی
مجھے خواہشِ غمِ آگہی، تجھے خواہشِ زر و مال ہے

مجھے سن ترانۂ درد میں، مجھے دیکھ چہرۂ زرد میں
مجھے ڈھونڈ غم کی پناہ میں کہ وہ میرا شاملِ حال ہے

میں ہوں باقرؔ ایسے مقام پر، نہیں کم نظر کا جہاں گزر
یہ عجیب منزلِ شوق ہے کہ نہ ہجر ہے نہ وصال ہے

◆◆

پھولوں کی بو، پھلوں کی حلاوت کہاں گئی
اے نخلِ زندگی تری لذّت کہاں گئی

کس دیس کو ہوا ہے برآمد غمِ عزیز
اے شہرِ دل متاعِ محبت کہاں گئی

ربِ کریم خلقِ خدا ڈھونڈتی ہے عدل
اس شہر میں نہ آئی قیامت کہاں گئی

ہے قفل کارخانۂ دل پر لگا ہوا
بازارِ جاں میں ڈھونڈ مروّت کہاں گئی

دل کی زمیں میں قوتِ نشوونما نہیں
اے سیلِ غم اُمنڈ تری طاقت کہاں گئی

ہر دل میں گرمِ کار ہوا نغمۂ ہوس
اے عشقِ بے نوا تری غیرت کہاں گئی

ہے سرد کاروبارِ جنوں شہرِ دل کی خیر
اے جذبِ شوق تیری حرارت کہاں گئی

دل کو ٹٹول کیا ہوئے وہ طَور زیست کے
آئینہ کیا بتائے وہ صورت کہاں گئی

باقرؔ یہ سرد مہری حالات دیکھیے
کیا پوچھیے سخن کی تمازت کہاں گئی

◆◆

پہنچے ساحل پر تو ہم اور ہم نشیں باہم نہ تھے
اپنی اپنی لہر میں کچھ وہ نہ تھا کچھ ہم نہ تھے

ہم کو پروازِ خلائے دل سے کب فرصت ملی
زندگی بھی مختصر تھی فاصلے بھی کم نہ تھے

گرد میں دنیا کی، پیاری صورتیں دھندلا گئیں
ورنہ اتنے بھی ان آنکھوں کے دیے مدھم نہ تھے

دوستو تازہ کرو گزرے ہوئے وقتوں کی یاد
جب تم آسودہ تھے اور ہم کو بھی اتنے غم نہ تھے

بھیڑ میں اہلِ ہوس کی عشق پسپا ہو گیا
اس گلی میں شہر اُمنڈ آیا تھا بس اک ہم نہ تھے

بس خود اپنے آپ سے لڑنے میں پیچھے رہ گئے
ورنہ ہمت میں تو ہم اہلِ وفا بھی کم نہ تھے

آئے گی خوابوں کی وادی سے کوئی تازہ ہوا
اب سے پہلے دل میں اتنے حبس کے موسم نہ تھے

اپنے ہی آشوب نے مارا ہمیں منزل سے دور
دل کی راہوں میں تو باقرؔ اتنے پیچ و خم نہ تھے

◆◆

درد کے ساگر کو لہریں دے دُکھ کے پہاڑ کو حرکت دے
روح کے بے حس سناٹوں کو گویائی کی قوت دے

ہجر کی کڑوی نیندوں میں بھی خواب ہیں میٹھی یادوں کے
خوابوں کو تعبیر عطا کر اور یادوں کو صورت دے

خالی رہنے والا کیسہ اور بھر آنے والا دل
اپنا تو مقسوم یہی ہے اب آگے جو محبت دے

تو رازق ہے عالمین کا دنیا کو دے سیم و زر
دل کے عالم پر بھی نظر رکھ ہم کو درد کی دولت دے

اہلِ ہوس کا حاصل دنیا، دنیا کا حاصل ہے ہوس
اے غمِ دل ہم اہل ہیں تیرے، جو کچھ تیری عنایت دے

سنگ سروں کو دلوں کو وحشت کانٹے آبلہ پاؤں کو
گل چہروں کو رنگت و نکہت شعلہ لبوں کو تمازت دے

کیسے کیسے موسم دل سے بے آواز گزرتے ہیں
اے مرے دل اب کے خوں ہو کر موسمِ گل کی شہادت دے

اُس کی اک تصویر بنا لوں دل کے صورت خانے میں
یادوں سے کچھ رنگ نچوڑوں اے غمِ دنیا مہلت دے

لفظ کی کاشت کرے گا باقرؔ اب کے موسمِ باراں میں
معنی کی یہ فصل ہو دونی، دل کی زمیں کو طاقت دے

◆◆

ایک ہی بڑھ کے ہے ہزار ٹوٹ کے ہے ہزار ایک
نشہ کے رنگ بے شمار کیفیتِ خمار ایک

آئی کدھر سے یہ ہوا سیلِ حیات اُمنڈ پڑا
جلوۂ گل ہے موج موج معجزۂ بہار ایک

تھی جو بہت وہ آنکھ مست ہم بھی کھڑے تھے دل بدست
پر نہ اٹھی ادھر کبھی وہ بھی تھی ہوشیار ایک

نجد کی راہ ہے الگ شہر کی راہ ہے الگ
جمِ غفیر شہر میں نجد میں ہے غبار ایک

بس یہی درد لیجیے اور سکون بانٹیے
شہر سے تا بہ شہرِ جاں اپنا ہے کاروبار ایک

جاگتی آنکھ میں خزاں اپنے پرے جمائے ہے
خواب کی رہگذر میں ہے قافلۂ بہار ایک

ق

احمد و ارشد ایک جاں، سمتِ مزاج ان کی دو
ایک ہے رازدانِ شہرِ دل کا ہے اشتہار ایک

ایک ہے دُور اک قریب ایک ہے یاد ایک دید
ایک تڑپ ہے روح کی جان کا ہے قرار ایک

جس کے پتے سے خلق کو منزلِ آگہی ملے
اہلِ دیار تم میں ہے باقرِؔ بے دیار ایک

◆◆

ہمیں چار سمت کی دوڑ میں وہی گرد بادِ صدا ملا
بنے اپنی ذات میں گونج ہم نہ خودی ملی نہ خدا ملا

کبھی شہر شہرِ خرد پھری کبھی دشت دشت جنوں گیا
مری زندگی مجھے کچھ بتا تجھے کیا ملا مجھے کیا ملا

اسے ڈھونڈتے تھے جو کُو بہ کُو وہ سفر کی گرد میں اَٹ گئے
کے راہِ نکہتِ گل ملی کسے نقشِ پائے صبا ملا

سرِ سطحِ ریگ لکھی ہوئی کوئی داستانِ جنوں ملی
سرِ لوحِ آب بنا ہوا کوئی نقشِ کارِ وفا ملا

کسے حال اپنا سنائیں ہم کسے شوق اپنا بتائیں ہم
کوئی ہم سفر ہے زمین کا کوئی ہم رکابِ ہوا ملا

کبھی کوئی آنکھ تو بھیگتی کبھی کوئی دل تو پسیجتا
مرے شوقِ تازہ نوائی کو یہ نواگری کا صلا ملا

مری بند آنکھ پہ وا ہوئے کئی درِ طلسمِ خیال کے
مجھے نیند آئے تو کس طرح مجھے خوابِ عہد فزا ملا

میں شجر ہوں موسمِ درد کا یہی رُت ہے میرے لیے سدا
کبھی شاخ شاخ ہری ملی کبھی برگ برگ جُدا ملا

یہی روشنی مرے ہاتھ ہے یہی تازگی مرے ساتھ ہے
کبھی کوئی داغ چمک اُٹھا کبھی کوئی زخم نیا ملا

مَیں چلا تھا شہر کی راہ سے مگر اپنی ذات میں گم ہوا
مجھے باقرؔ اپنی تلاش تھی مجھے آج اپنا پتا ملا

◆◆

مَیں بیاباں ہوں مری پیاس پہ حیراں کیوں ہے
مجھ پہ آیا ہے برسنے تو ہراساں کیوں ہے

مجھے اتنا تو بتا دے مری تسکینِ حیات
خود ہی کھینچے ہے تو پھر خود ہی گریزاں کیوں ہے

شوقِ آوارگیِ دل تو بیاباں مانگے
پھر وہی واقفِ اسرارِ بہاراں کیوں ہے

رنگ پابند ہے نکہت ہے ہواؤں میں اسیر
قید خانے کا یہاں نام گلستاں کیوں ہے

کس کا نقشِ کفِ پا ڈھونڈتی پھرتی ہے صبا
بوئے گل صحنِ گلستاں میں پریشاں کیوں ہے

پیشِ طوفاں بھی خموشی ہے پسِ طوفاں بھی
زندگی لمحۂ طوفاں ہے پہ طوفاں کیوں ہے

چل گزرگاہِ تمنا میں نکل تنگ نہ بیٹھ
دل جو رکھتا ہے تو دنیا سے گریزاں کیوں ہے

راز بن کر جو مرے دل میں اتر آیا تھا
رنگ بن کر مری آنکھوں سے نمایاں کیوں ہے

اسی تعبیر میں اک عمر گنوائی باقرؔ
زندگی خواب ہے پر خواب پریشاں کیوں ہے

◆◆

خوشبو تھی سانس سروِ خراماں شباب تھا
وہ دن بھی تھے کہ اس کا پسینہ گلاب تھا

لوحِ جبیں پہ نقش تھا اک روشنی کا پھول
عنوانِ شوق آنکھ تھی چہرہ کتاب تھا

نظریں اسی پہ سارے وفا کردگاں کی تھیں
ہر آنکھ اک سوال تھی اور وہ جواب تھا

اہلِ دول کے ساتھ فقیہان شہر تھے
وہ اہلِ دل کی بزم میں عالی جناب تھا

ہر شہ کو شہ تھی اس کے پیادوں کے سامنے
ہر رُخ بساطِ دہر پہ ایک انقلاب تھا

ہر کاٹ تھی بنامِ علیؑ ذوالفقار کی
ہر ضرب کے حصار میں خیبر کا باب تھا

اے شب پرست تیرے چراغاں میں رات بھر
پھر روشنی اسی کی ہے جو آفتاب تھا

اے تیرہ بخت آ مری آنکھوں میں دھول جھونک
میں کیسے یہ کہوں کہ یہ دریا سراب تھا

◆◆

اسمِ اعظم سے طلسمِ رنگِ شب کٹ جائے گا
اِک قدم حاتم! ابھی سنگِ گراں ہٹ جائے گا

رات کا جادو ستاروں کی ہنسی سورج کی قید
اِک کرن پھوٹی تو یہ سارا فسوں چھٹ جائے گا

کب تلک بادل کے جامے میں فضا بل کھائے گی
دھوپ کی انگڑائی سے یہ پیرہن پھٹ جائے گا

ٹھوکروں سے گرد اُچھلے گی سروں سے پگڑیاں
راہ کے اس شغل میں سارا سفر کٹ جائے گا

سب سمجھتے تھے کہ دھمکی سے نکل آئے گا کام
کس کو یہ معلوم تھا وہ سامنے ڈٹ جائے گا

اب جو رُت بدلی تو رندوں کی مچے گی ہاؤ ہو
شیخ کا جامہ تبرّک کی طرح بٹ جائے گا

نعرۂ حق سے ہر اِک دیوار کو شق دیکھنا
ٹوٹے گی زنجیرِ پا، طوقِ گلو کٹ جائے گا

◆◆

یہی سنتے آئے ہیں ہم نشیں کبھی عہدِ شوقِ کمال میں
کوئی شہر، شہرِ وفا بھی تھا اسی سرزمینِ خیال میں

مرے دل کے خون کی شکل تھا تجھے یاد ہے مرے دلربا
کوئی رنگ، رنگِ حنا بھی تھا ترے نقش ہائے جمال میں

نہ وہ جھانکنا ہے گلی گلی نہ وہ تاکنا ہے کلی کلی
نہ کسک ہے ہجر کے درد میں نہ دمک ہے شوقِ وصال میں

کوئی اک چمک مرے دل کو دے کہ سفر حدودِ زماں کا ہے
کوئی ایک ساعتِ روشنی مری گردشِ مہ و سال میں

مجھے شرق و غرب سے کام کیا کہ مقامِ شوق گزر گیا
یہ خلائے دل کے ہیں دائرے یہ سفر ہے اب مرا حال میں

وہ جو راہِ ظلم پہ آندھیوں میں چراغ لے کے نکل پڑے
وہ زوالِ عصر کے سربلند کہاں ہیں عصرِ زوال میں

یہ جو تیرگی کا طلسم ہے یہی روشنی کا بھی اسم ہے
ہوا باقرؔ آپ کے قول کا بھی شمار قولِ محال ہے

◆◆

جاں فزا ہے رمزِ فطرت دلکشا تحریرِ رنگ
ہے کلامِ نکہتِ گُل سے عیاں تاثیرِ رنگ

ایک زنداں خانۂ گُل میں ہوئے دونوں اسیر
رنگِ گُل تعزیرِ بُو، اور بوئے گُل تعزیرِ رنگ

مَیں مصوّر کو کروں تصویر سے کیسے الگ
یہ مرا رنگِ تصوّر ہے کہ ہے تصویرِ رنگ

رنگِ حُسن اِک پردۂ زیبا ہے حُسنِ رنگ کا
ہے گلستاں ایک صورت خانۂ تشہیرِ رنگ

ہر طرف ہے جشن ساماں شورِ سودائے بہار
رقصِ بوئے گُل سرورِ نغمۂ زنجیرِ رنگ

اپنے اپنے رنگ میں دونوں نہ قائم رہ سکے
وہ ترا رنگِ تغیّر، یہ میری تغییرِ رنگ

کھینچیے رنگِ تصوّر میں اُسے پھر دیکھیے
کیسے کیسے رنگ دکھلاتی ہے یہ تنویرِ رنگ

یہ شفق گویا خمارِ مستیِ انوار ہے
مہر کی میراث ہے باقرؔ یہی جاگیرِ رنگ

◆◆

نواحِ شوق میں ہے اِک دیارِ نکہتِ گُل
زمیں پہ گُل ہیں فضا میں غبارِ نکہتِ گُل

یہ شہرِ گُل بدناں سیر گاہِ حُسنِ تمام
کہیں ہے نہر کہیں آبشارِ نکہتِ گُل

نسیمِ صبح بھی لیتی ہے یاں پہ اذنِ خرام
ہے یہ مقام، مقامِ قرارِ نکہتِ گُل

گماں یہ ہے کہیں دیوارِ رنگ ٹوٹ نہ جائے
حصارِ رنگ پہ ہے وہ فشارِ نکہتِ گُل

یہاں کے مرغ خوش الحاں و مہر زر افشاں
ہیں نور و نغمہ یہاں ہمکنارِ نکہتِ گُل

یہاں کی قوسِ قزح کو ملا ہے اذنِ دوام
بہار رنگ دلیلِ بہارِ نکہتِ گُل

اُفق پہ نور کا دریا ہے رنگ کی کشتی
ہے انتظار میں کس کے نگارِ نکہتِ گُل

کسے خبر ہے کہ باقرؔ فدائے حُسنِ بہار
یہیں کہیں ہے غریبِ دیارِ نکہتِ گُل

◆◆

جرمِ اظہارِ تمنّا آنکھ کے سر آ گیا
چور جو دل میں چھپا تھا آج باہر آ گیا

میرے لفظوں میں حرارت میرے لہجے میں مٹھاس
جو کچھ اُن آنکھوں میں تھا میرے لبوں پر آ گیا

جن کی تعبیروں میں تھی اک عمر کی وارفتگی
پھر نگاہوں میں انھیں خوابوں کا منظر آ گیا

شہر کے آباد سنّاٹوں کی وحشت دیکھ کر
دل کو جانے کیا ہوا میں شام سے گھر آ گیا

پہلے چادر کی ہوس میں پاؤں پھیلائے بہت
اب یہ دُکھ ہے پاؤں کیوں چادر سے باہر آ گیا

ہم دِوانوں کے لیے تھیں وسعتیں ہی وسعتیں
ختم جب صحرا ہوا آگے سمندر آ گیا

تم نے باقرؔ دل کا دروازہ کھلا رکھا تھا کیوں
جس کو آنا تھا وہ آخر درد بن کر آ گیا

◆◆

جوابِ بے سوال چند خواب ہیں خرید لو
سوال ہوں نہ ہوں یہ لاجواب ہیں خرید لو

اِنھیں میں شرحِ زندگی، اِنھیں میں طرحِ زندگی
کتابِ دل کے چند اہم باب ہیں خرید لو

کلید کامیابیوں کی امتحانِ عشق میں
یہ درسِ شوق شاملِ نصاب ہیں خرید لو

یہ چند داغِ دل ہوس کی آنکھ سے بچے ہوئے
اندھیری شب کے نجم و ماہتاب ہیں خرید لو

دعائیں بھی شکستہ دل کی چند میرے پاس ہیں
یہ بارگاہِ ربّ میں مستجاب ہیں، خرید لو

یہ چند اشکِ رایگاں کشیدِ چشمِ بے کساں
یہ قطرہ قطرہ خون کا حساب ہیں، خرید لو

وہ جانِ رنگ و بو ہے باقرؔ اس کو رنگ و بو ہی دو
دُکانِ دل میں کچھ کھِلے گلاب ہیں خرید لو

◆◆

ہے دکانِ شوق بھری ہوئی کوئی مہرباں ہو تو لے کے آ
زرِ داغِ دل کا سوال ہے، کوئی نقدِ جاں ہو تو لے کے آ

رہی یہ فضا تو جئیں گے کیا کوئی اب بنائے دگر اٹھا
کوئی ہو زمیں تو نکال اُسے کوئی آسماں ہو تو لے کے آ

جو ہو ذوقِ درد کا یہ سماں تو اچھال دے کوئی آسماں
ترے داغِ دل مہ و مہر ہیں، کہیں کہکشاں ہو تو لے کے آ

یہ ہے شامِ موسمِ درد کی، یہ ہے صبحِ چہرۂ زرد کی
ہے بہار پر غمِ زندگی کوئی دل خزاں ہو تو لے کے آ

یہ سفر ہے منزلِ شوق کا، کوئی ہم سفر کوئی ہم نوا
کسی دل شکستہ کو ساتھ لے، کوئی سرگراں ہو تو لے کے آ

یونہی اپنے آپ سے گفتگو جو رہی تو پھر نہ رہے گا تُو
کوئی ہم خیال تلاش کر، کوئی ہم زباں ہو تو لے کے آ

ذرا خود سے باقرِؔ بے نوا تُو نکل کہ طے ہو معاملہ
اِنھیں مل، یہ لوگ ہیں اہلِ دل، غمِ رائیگاں ہو تو لے کے آ

◆◆

اس دل کو کیا کہیں کہ جدھر تھا اُدھر نہ تھا
تھا جس پہ اعتبار وہی معتبر نہ تھا

تھے راہ میں ہزار کوئی راہ پر نہ تھا
ہمراہ تو بہت تھے کوئی ہم سفر نہ تھا

اہلِ ہوس تمام تھے آغوش وا کیے
پر اپنی طرح ایک بھی سینہ سپر نہ تھا

پرواز تھی فضائے زمان و مکاں سے دور
مَیں بے نیازِ دہر تھا بے بال و پَر نہ تھا

ہر سُو بسی ہوئی تھی مگر ڈھونڈتے کہاں
خوشبو کا کوئی رنگ نہ تھا کوئی گھر نہ تھا

اپنی ہی کچھ کمی تھی جو ناکام ہم ہوئے
دل کاربندِ شوق تو تھا کارگر نہ تھا

باقرؔ ہوائے شوق اڑائے پھری مجھے
میں خانماں خراب کبھی دربدر نہ تھا

◆◆

عشق تو ساری عمر کا اِک پیشہ نکلا
ہم نے کیا سوچا تھا یارو کیا نکلا

دل کا پتھر پگھلے تو کیا نکلے گا
پتھر کا دل پگھلا تو دریا نکلا

بھاگ رہا ہے دریا بھی ساگر کی طرف
پیاس بجھانے والا خود پیاسا نکلا

صبح سویرے تھی کرنوں کی بزم سجی
شام کو گھر سے تنہا اک سایہ نکلا

اتنی عُمر میں اپنے معنی کچھ نہ ملے
دل میں صورت آنکھوں میں سپنا نکلا

دل کے سفر میں لہو کا دریا پار کیا
اس کے آگے صحرا ہی صحرا نکلا

لے کے فقیری آس لگائی دنیا سے
باقر پیارے تو بھی سگِ دنیا نکلا

◆◆

آئیں جو جنسِ دل کے خریدار، کچھ تو ہو
اس شہرِ جاں میں گرمیِ بازار، کچھ تو ہو

سر اپنا، اپنے درد کی دیوار سے نہ پھوڑ
اک آہ کھینچ صورتِ اظہار کچھ تو ہو

پھر کربلا ہے گرم سرِ عرصۂ حیات
ہاں کچھ بنامِ ابنِ علیؑ، یار کچھ تو ہو

ہاں کچھ فروغِ اہلِ وفا بھی تو چاہیے
غمزہ ہو ناز ہو مرے دلدار کچھ تو ہو

اتنی خموش بزمِ تمنا کبھی نہ تھی
دیوار ہی سُنے، پسِ دیوار کچھ تو ہو

کب تک سنا کرو گے یہ ہاں ہاں، نہیں نہیں
اس بے وفا سے بزم میں تکرار کچھ تو ہو

ان سرگرانیوں میں بھی باقرؔ مگن ہو تم
ہے بارِ غم تو دل میں غمِ یار کچھ تو ہو

◆◆

بکھر کے بنتے ہیں بن بن کے ہم بکھرتے ہیں
یہ شغل خوب ہے، دن کھیل میں گزرتے ہیں

عجب یہ ہے کہ اب اپنی حکایتِ غمِ دل
ہم اپنے آپ سے کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں

کتابِ دل میں لکھی ہیں صداقتیں کیا کیا
جو اہلِ علم سمجھتے ہیں اور مکرتے ہیں

یہ خواہشوں کے ہیولے یہ پیکرِ اوہام
مرے وجود میں سرگوشیاں سی کرتے ہیں

ہوائے دہر میں ٹھہرے کہ ہم لباب تھے
ہے اتنا ظرف کہ دُکھ زندگی کے بھرتے ہیں

دیارِ شوق میں سیکھی یہ کیمیا اک عمر
اب اپنی آگ میں جلتے ہیں اور نکھرتے ہیں

بنے ہیں حضرتِ باقرؔ بھی پیروِ غالب
اُسی کو دیکھ کے جیتے ہیں جس پہ مرتے ہیں

◆◆

بھلا اور کون ہو آشنا دمِ سرد کا، رُخِ زرد کا
تجھے سب خبر مرے دل کی ہے کہ تو عکس ریز ہے درد کا

کوئی ناپتا ہے حدِ مکاں کوئی سَر کرے ہے حدِ زماں
وہ ہے کام دشت نورد کا، یہ مقام کوچہ نورد کا

یہ عجب نہیں کہ ہو حبسِ جاں میں بھی لہر کوئی بہار کی
کبھی تُو بھی دیکھ جو ربط ہے دلِ گرم سے دمِ سرد کا

ابھی جاگ اُٹھے گی نوائے دل، ابھی گونج اُٹھے گی فضائے جاں
کوئی سُر لگایئے شوق کا، کوئی راگ چھیڑیئے درد کا

کوئی جاں پہ کھیلے تو بات ہے کہ یہ کارگاہِ حیات ہے
کوئی فردِ بازیِ عشق میں کوئی مردِ کارِ نبرد کا

مرے دل کو ہے جو قرار سا، سوئے نجدِ جاں ہے غبار سا
کسی قافلے کی یہ گرد ہے کہ یہ خود ہے قافلہ گرد کا

کوئی باقرِ ایسا جری تو ہو، کہے حرفِ حق کھنچے دار پر
کہ یہ کارِ شوقِ بلند ہے، نہیں کام آپ سے فرد کا

◆◆

پیار بھری نظروں کے ہنر سے حُسن بھی روبہ کمال ہوا
میری نظر سے خود کو جو دیکھا کیسا چہرہ لال ہوا

تجھ سے مل کر خضر کی مشکل راہیں مجھ پر سہل ہوئیں
تیری آنکھ کا امرت پی کر میں آپ اپنی مثال ہوا

دل میں چہرہ اور کسی کا سامنے صورت اور کوئی
کس سے دوری کس کی حضوری کیسا ہجر و وصال ہوا

کیوں وہ رُکا تھا چلتے چلتے، کیوں ہم آگے نکلے تھے
اب تک دل اس میں اُلجھا ہے کیسے حل یہ سوال ہوا

ہم بھی آنسو پی ہی لیں گے، تم بھی بات بنا لو گے
درد کا ساجھا کیسے بٹے گا تمھیں کبھی یہ خیال ہوا

دکھ کی کئی فصلیں کاٹی ہیں تب یہ زمیں گُل خیز ہوئی
پیار کا بیج جو پھوٹا دل میں پل بھر میں وہ نہال ہوا

موسم کے سب رنگ دکھائے تیرے پیار کے جادو نے
دل نے مجھ کو پیار سے دیکھا میں بھی آج بحال ہوا

اب کے برس یادوں کے کھنڈر میں لال گلاب کہاں سے کھلے
اتنے رنگ اور اتنی خوشبو، یارو یہ بھی کمال ہوا

باقرؔ کو ہم نے بھی دیکھا اُجڑا اُجڑا پھرتا تھا
مدت سے اس سمت نہ آیا اب کے بہار میں سال ہوا

◆◆

کبھی اُلجھا تیز ہواؤں سے، کبھی بکھرا اپنی طبیعت میں
کوئی رنگ تو ہے کوئی ڈھنگ تو ہے تری زلفوں کا مری وحشت میں

تو دریا تھا تو چڑھا بہت، موجوں میں اپنی بڑھا بہت
ہم ساحل تھے ہم ڈوب گئے تری سنگت میں تری چاہت میں

کچھ سکّے داغِ محبت کے کچھ سونا اپنی طبیعت کا
اسی مال پہ ٹھہرے دل کے غنی کچھ فرق نہ آیا عزت میں

کچھ شوق کے ساماں لے کے چلے، کچھ پھول چنے کچھ خواب بُنے
ہم شہرِ وفا کے تاجر تھے چمکے بازارِ محبت میں

ہم فرد قبیلۂ درد کے تھے ہم معنیٔ صورتِ زرد کے تھے
کب فخر ہمیں تھا سیادت کا، کب درک ہمیں تھا قیادت میں

وہ معنیِ دل ہم طرزِ ادا، وہ نکہتِ گل، ہم موجِ ہوا
کبھی ڈھل گئے شعر کی صورت میں کبھی اُڑ گئے شوق کی لذت میں

کوئی دل پگھلے کوئی آنکھ بھرے، کوئی آہ کھنچے، کوئی درد اُٹھے
کوئی پھول کھلے تری رنگت کا کوئی گیت ڈھلے تری صورت میں

اے تازہ ہواؤں کی موجو! چلو مست گھٹا کے ساتھ چلیں
یہ اُمنڈی ہے تو برسے گی، کسی منزل پر کسی ساعت میں

کچھ باقرؔ پر موقوف نہیں یہ طرز ہے اہلِ محبت کی
بدنام ہو اپنی خوبی میں، گمنام ہو اپنی شہرت میں

◆◆

❁

نہ ہوس ہے دولت و مال کی، نہ ہوائے منصب و جاہ ہے
مجھے عافیت تری چاہ میں کہ وہ دل کی شہر پناہ ہے

جنھیں ناز ہے ترے پیار پر، وہ ہیں ریت رسم سے باخبر
کبھی عجزِ سجدۂ شوق ہے، کبھی کج جبیں پہ کلاہ ہے

ترا کام حسن بکھیرنا مرا کام حسن سمیٹنا
تو نگاہِ حسن سے کام لے، مرے پاس حسنِ نگاہ ہے

یہ ہے کارگاہِ وفا یہاں، نہ سکونِ دل، نہ قرارِ جاں
نہ بچاؤ کی کوئی سمت ہے، نہ فرار کی کوئی راہ ہے

ہے کتابِ شیخ کی یہ سند نہیں اس میں پیار کی کوئی مد
یہ ثواب ہے، وہ عذاب ہے، یہ مباح ہے، وہ گناہ ہے

جو بساطِ عشق پہ آ گئے، کوئی رُخ چلیں انھیں مات ہے
سبھی کشتہ ہیں تری چال کے نہ پیادہ کوئی نہ شاہ ہے

میں شکستِ دل سے نہ بچ سکا مگر اپنی ذات سے جنگ میں
مرا حرف ہے اسلحہ مرا شعر سپاہ ہے

غمِ زندگی کا ہُنر سہی، غمِ آگہی کی نظر سہی
نہیں تیرے وصل کی سرخوشی ترے ہجر سے تو نباہ ہے

یہ ہے تیرا باقرؔ بے نوا، نہیں اِس کا کوئی ترے سوا
کبھی اپنے حال میں مست ہے کبھی آہ گاہ بہ گاہ ہے

◆◆

پردہ جو اُٹھا حجاب دیکھا
کیا خواب میں ہم نے خواب دیکھا

ہر لفظ میں اِک عذاب دیکھا
بس عشق کا ایک باب دیکھا

اُگتے ہوئے درد کے شجر کو
ہم نے پسِ ماہتاب دیکھا

وہ سادہ ہی آ کھڑا ہوا تھا
آئینے کا اضطراب دیکھا

کیوں صبحِ بہار چپ کھڑی ہے
شاید اسے بے حجاب دیکھا

آغوش میں صبح کو صبا کی
بھیگا ہوا اک گلاب دیکھا

بارِ غمِ جاں سے تھا جو بوجھل
لو پھوٹ پڑا سحاب دیکھا!

شرمندہ تھے چھیڑ سے ہوا کی
ہر قطرے کو آب آب دیکھا

اِک بار تو عشق نے اُبھارا
پھر نقش بہ سطحِ آب دیکھا

تھے ریت پہ کچھ نشاں جنوں کے
پھر ان کی جگہ سراب دیکھا

رونق پہ دیارِ عشق کب تھا
ہر گھر کو یہاں خراب دیکھا

کیوں پیار جتاؤ ہر کسی سے
پیار سے جو ملا جواب دیکھا؟

حیران جو پھر رہا ہے باقرؔ
دیوانے نے کوئی خواب دیکھا؟

◆◆

نظم یہ واقعہ ہوا دل کی کتاب میں کہیں
موجِ ہوا اُلجھ گئی شاخِ گلاب میں کہیں

لفظ حجاب بن گیا نکتۂ شوق چھپ گیا
مرے سوال میں کہیں تیرے جواب میں کہیں

نسخۂ عیشِ دہر تو ہم کو بھی یاد تھا کبھی
ذہن سے سب اُتر گیا عشرتِ خواب میں کہیں

آب و ہوائے دل میں ہے ایک خزاں کی رُت لکھی
اپنی کتابِ عمر میں، عشق کے باب میں کہیں

سیر کبھی ہوئے تو تھے منزلِ شوق سے پرے
پیاس میں ہم بھٹک گئے خواہشِ آب میں کہیں

رنگ محل بنائے ہیں عشق نے ریت پر کبھی
کشتیِ دل چلائی ہے عین سراب میں کہیں

اس کی مہک سے جسم و جاں آج بھی ہیں بسے ہوئے
پھول تھا اک کھلا ہوا منظرِ خواب میں کہیں

وقت کے راگ سیکھیے باقرِؔ بے نوا سے کیا
زیست کا کچھ ہنر تو ہو خانہ خراب میں کہیں

◆◆

اُس شوخ سے ربط دل لگی کے
قربان خود اپنی سادگی کے

دل کا نہیں اعتبار، ہشیار
چکر میں نہ آنا سازشی کے

دشمن سے نباہ آ گیا ہے
وہ گھاؤ لگے ہیں دوستی کے

جینے کو جو ڈھیل دے رہے ہیں
کھینچے ہیں عذاب جاں کنی کے

سایوں نے قدم پکڑ لیے ہیں
کیوں ساتھ چلے تھے روشنی کے

یوں دل سے نباہ کر رہے ہیں
مہمان ہوں جیسے اجنبی کے

ٹوٹے ہوئے تار جوڑتے ہیں
بھٹکے ہوئے راگ زندگی کے

تھیں درد کی ساعتیں منوّر
روشن ہوئے راز آگہی کے

دل گونج اُٹھا نوائے جاں سے
دیکھو یہ طلسم خامشی کے

خود سے جو ملے تو یہ کھلا ہے
سو روپ ہیں ایک آدمی کے

دنیا سے نباہ کا صلہ کیا
دیکھیں گے کچھ اور روز جی کے

گھٹتے ہوئے حوصلوں کا اظہار
بڑھتے ہوئے ہاتھ دوستی کے

آساں نہیں صلح و جنگ خود سے
یہ کام بھی ہیں کسی کسی کے

اک رُخ پہ زمانہ کب ہے سُنیے
چرچے ہر سُو ہیں بے رُخی کے

اِک دل ہے اور اتنی کھینچا تانی
ہیں روپ ہزار دل کشی کے

ٹوٹے ہوئے لفظ جوڑنے ہیں
یہ کام نہیں روا روی کے

یوں جڑتے ہیں زندگی کے رشتے
باقرؔ یہ ہنر ہیں شاعری کے

◆◆

کم ظرف بھی ہے، پی کے بہکتا بھی بہت ہے
بھرتا بھی نہیں اور چھلکتا بھی بہت ہے

اللہ کی مرضی کا تو سختی سے ہے پابند
حاکم کی رضا ہو تو لچکتا بھی بہت ہے

کوتاہ قدی کہتی ہے کھٹے ہیں یہ انگور
لیکن گہ و بے گاہ لپکتا بھی بہت ہے

پروا ہے نہ کچھ تال کی نے سُر کی خبر ہے
پر سازِ پہ دنیا کے مٹکتا بھی بہت ہے

شوریدگی بڑھتی ہے درِ لیلیٰ زر پر
دیوار پہ یہ سر کو پٹکتا بھی بہت ہے

محفل میں تو سُنیے ہوسِ جاہ پہ تقریر
پہلو میں یہی خار کھٹکتا بھی بہت ہے

باقرؔ جو بھٹکتا ہے معانی کے سفر میں
ہو صورتِ زیبا تو اٹکتا بھی بہت ہے

◆◆

سر سے جنونِ عشق کا سودا نکالیے
یا اپنے دل سے خواہشِ دُنیا نکالیے

یا ہاتھ باندھ لیجیے دنیا کے سامنے
یا ہاتھ کھول کر یدِ بیضا نکالیے

یا موم بن کے خود کو حوادث میں ڈھالیے
یا سنگ سے شرارِ تمنا نکالیے

یا پیاس اپنی ابر کرم سے بجھایئے
یا خود پہاڑ کاٹ کے دریا نکالیے

یہ کیا کہ ساری عمر بہ طرزِ جنابِ شیخ
پگڑی سے اپنی علم کا طرّہ نکالیے

تحقیق میں تو بال کی بھی کھال کھینچیے
تخلیق میں پہاڑ سے جو چوہا نکالیے

طاقت کے آگے گربۂ مسکیں کی میاؤں میاؤں
ناطاقتی کو دیکھ کے پنجہ نکالیے

ناحق کی واہ واہ میں تقریر دل پذیر
حق کے خلاف عقل کا شوشہ نکالیے

بے باک ہے جو باقرؔ آشفتہ سر بہت
کچھ اس کی سرزنش کا بہانہ نکالیے

◆◆

صورت میں خیال ڈھونڈتا ہوں
انساں کی مثال ڈھونڈتا ہوں

جو کھوئے گئے روا روی میں
مَیں وہ مہ و سال ڈھونڈتا ہوں

غربت میں ہوں شہرِ بے اماں میں
اِک واقفِ حال ڈھونڈتا ہوں

حل ہو کے جواب بن گیا ہوں
اب اپنا سوال ڈھونڈتا ہوں

اے آئینہ رُو ذرا اِدھر دیکھ
مَیں وجہِ جمال ڈھونڈتا ہوں

جو ہجر کے سیل میں ہوا غرق
وہ شہرِ وصال ڈھونڈتا ہوں

اس عصرِ زوالِ آدمی میں
مَیں روحِ کمال ڈھونڈتا ہوں

جس کا نہیں کوئی مثل باقرؔ
کیوں اس کی مثال ڈھونڈتا ہوں

◆◆

جو خون تھا رگ و پے میں تو دل میں خواب بنے
چھلک پڑا تو چمن در چمن گلاب بنے

مٹھاس تیری نگاہوں کی حرف و شعر بنائے
بڑے مزے ہوں جو اس طرح اک کتاب بنے

خدا کرے ترے چہرے پہ ہو وہ تابش و نور
کہ آئینہ تجھے دیکھے تو آفتاب بنے

ڈھلی ترے قد و رُخ میں تمام رعنائی
غرض یہ تھی کہ بنے جو وہ لاجواب بنے

یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا تقاضا ہوا
گلوں میں شہد، رگِ تاک میں شراب بنے

یہ کس کے حکم سے باہم دگر ہیں سارے تضاد
بنے جو آب میں گوہر، گہر میں آب بنے

جلالِ شدتِ عرضِ جمال ہے باقرؔ
جو آفتاب ہو دھیما تو ماہتاب بنے

◆◆

دشتِ ہجر سے شہرِ وصال ہے کتنی دور
حال سے منزلِ استقبال ہے کتنی دور

موسمِ جاں کی سرد ہوائیں کیسے بتائیں
کون سی سمت میں شہرِ خیال ہے کتنی دور

گردِ سفر سے ساری آنکھیں دھندلائیں
کس کو خبر ہے صبحِ جمال ہے کتنی دور

یوں بھی تھکن میں ایک دلاسا ملتا ہے
پیچھے دیکھو گردِ ملال ہے کتنی دور

چاند کی پہلی رات سے کچھ اندازہ ہوا
بدر کی راہِ کسبِ کمال ہے کتنی دور

جانے والے سال کی رُت کا ماتم ہے
آنے والی خوشی کا سال ہے کتنی دور

کب تک یوں آزاد پھرو باقر صاحب
دیکھو ان زلفوں کا جال ہے کتنی دور

◆◆

جھجک یہ ہے کہ جو مانگیں تو کیا دعا مانگیں
اُسے تو ساری خبر ہے پھر اس سے کیا مانگیں

یہ گوشہ گیری فقیری نہیں قناعت ہے
اُنھیں یہاں سے تو ہر اک سے راستا مانگیں

زمین تنگ ہوئی آسمان ساکت ہے
یہ رات چین سے کٹ جائے یہ دعا مانگیں

جو کوچے حُسن و محبت کے تھے بَنگل گیا شہر
اب آؤ دشتِ غریبی سے آسرا مانگیں

جو عشق ہے تو مداوائے غم کی فکر ہو کیوں
جو درد مول لیا ہے تو کیوں دوا مانگیں

جو بات سے بھی گریزاں ہو اُس سے کیا پوچھیں
جو دل کا بھید سمجھتا ہو اُس سے کیا مانگیں

وہ جن کو زیست نے مرنے کا حوصلا نہ ملے
وہ خوفِ مرگ سے جینے کا حوصلا مانگیں

چلے تو کشتِ معانی لہک لہک اُٹھے
بندھے تو لفظ ہوں وابستہ وہ ہوا مانگیں

گدائی درِ مولا ملی چلیں باقرؔ
لگائیں ظرف کی اپنے کوئی صدا، مانگیں

◆◆

مجھے خون بہا یہ ملا ہے میرے شباب کا
کہ زمینِ دل پہ کھلا ہے پھول گلاب کا

وہی صورتیں کہ جو آج خواب و خیال ہیں
اُنھیں صورتوں میں جمال تھا کسی خواب کا

وہ سبق جو غم کا پڑھا تھا عشق کے باب میں
وہ جواز ہے مری زندگی کے نصاب کا

مرے دشتِ جاں میں طلسم خانۂ دل تلک
نہ تو آب ہے نہ فریب کوئی سُراب کا

مَیں نفی سے اپنی بڑھا تو ضرب سے گھٹ گیا
وہ جو حل نہ ہو وہ سوال ہوں میں حساب کا

مَیں خمارِ زیست ہوں ٹوٹنا مرا کام ہے
وہ ہے لہر میں کہ نشہ ہے موجِ شراب کا

نہیں شامل آج جو زندگی کے نصاب میں
وہی جاں فروز تھا باب دل کی کتاب کا

مَیں طلسمِ جاں سے خود اپنے دل میں ہوں اِک چمن
مجھے آسرا ہے بہار کا نہ سحاب کا

وہ جو مہرباں ہے تو باقرؔ اس میں غرور کیا
یہ دماغ عرش پہ کس لیے ہے جناب کا

◆◆

ہوس کی کارگاہ سے طلب کی کارزار کا
یہ دو قدم کا فاصلہ ہے زیست کے مدار کا

خلائے جاں کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں ہے
دلوں کی سمت تھا رواں جو کارواں بہار کا

بھلا ہے تیرے پیار کا جو میرے دل میں ہے، کھلا
قرارِ جاں کی روشنی میں پھول انتظار کا

مری شناخت بس یہی کہ ہوں ترے طواف میں
تو کچھ بھی ہو مگر ہے تو مدار میرے پیار کا

یہ ہجر جھیلنا یہ رنجِ انتظار کھینچنا
اسی سے حوصلا ملا ہے اہلِ دل کو ہار کا

وہ کاروبارِ جاں گیا کہ مول اب نہیں رہا
نہ آہِ جاں گداز کا نہ چشمِ اشکبار کا

عجب ہوا کہ دل کی بات مان لی غضب ہوا
ہمیں تو کچھ پتا نہ تھا وفا کی رہگزار کا

یہ آگ ہے وہ خون ہے سنبھل سکیں نہ چل سکیں
نہ راہ ہے قرار کی نہ راستہ فرار کا

چلا ہے باقرؔ آج پھر دیارِ شوق کی طرف
وہی تو اک ٹھکانا رہ گیا ہے میرے یار کا

◆◆

زباں کو ذائقۂ شعرِ تر نہیں ملتا
بڑھا ہے زور زباں میں اثر نہیں ملتا

خود اپنے حال کی کوئی خبر نہیں ملتی
کوئی بھی جذبۂ دل معتبر نہیں ملتا

سبھی ہیں کھوئی ہوئی منزلوں کی گرد میں گم
سفر بہت ہے مآلِ سفر نہیں ملتا

جو دشت میں تھے وہ بیگانۂ خلائق تھے
جو شہر میں تھے انھیں اپنا گھر نہیں ملتا

عجیب طور ہیں اب کارگاہِ دنیا کے
غرورِ عشق جوازِ ہنر نہیں ملتا

بیانِ شوقِ سفر اہلِ درد کا ہے بہت
مگر نشانِ سرِ رہگذر نہیں ملتا

فراغِ دل نہیں اب کوئے گل رخاں میں کہیں
کہ زخم کوئی یہاں کارگر نہیں ملتا

دیارِ شوق میں یا کوچۂ ملامت میں
کہیں بھی باقرِؔ آشفتہ سر نہیں ملتا

◆◆

یہ خواب تھا کہ فسونِ طلسمِ جاں کوئی
سُنا گیا مجھے بھولی کہانیاں کوئی

ڈھلے ہیں کارگہِ دل میں مہر و ماہ بہت
انھیں سے کیوں نہ بنا لیں ہم آسماں کوئی

نہ سرد کامیِ اہلِ ہوس، نہ گرمیِ شوق
عجیب شہر ہے موسم نہیں یہاں کوئی

بس ایک وحشتِ بے کیف کے حصار میں گم
یہ زندگی ہے کہ ہے سعیِ رائیگاں کوئی

فضائیں اور ہوں خوابوں کی رہگزر کے لیے
زمینِ دل کے لیے اور ہوں زماں کوئی

کوئی سُنے تو دلِ درد مند کی آواز
کہیں کہے تو محبت کی داستاں کوئی

غبارِ راہ ہے سیلِ ہوا کی منہ زوری
کہ نجدِ جاں سے گزرتا ہے کارواں کوئی

خلائے جاں سے ہے آگے طلسم خانۂ شوق
جو حوصلا ہو کرے سَر یہ ہفت خواں کوئی

مثالِ گردِ سفر بیٹھتے گئے باقرؔ
نہیں ہے نقشِ قدم کا یہاں نشاں کوئی

◆◆

نئی وسعتوں کے سمیٹنے کو جو آج اوجِ مکاں میں ہیں
یہ مقامِ شوق سے بے خبر نہ زمیں پہ ہیں نہ زماں میں ہیں

تجھے لفظ میں ڈھالنا بھی ریاضتِ شب و روز تھی
وہ جو دُکھ بھرے ترے پیار میں وہی آج طرزِ بیاں میں ہیں

بس انھیں کے زور پہ ہم نے بارِ نشاطِ درد اُٹھا لیا
یہی چند قطرے لہو کے جو رگِ دل میں تھے رگِ جاں میں ہیں

وہ خیال و خواب کی کھیتیاں تو زمیں کے شور سے جل گئیں
مگر اگلی فصلوں کے بیج کچھ ابھی اہلِ دل کی دکاں میں ہیں

یہی دو حصار ہیں جن میں اب مرے ہم نفس ہیں گھرے ہوئے
کئی کاہشِ غمِ دل میں ہیں، کئی کاوشِ غمِ جاں میں ہیں

شبِ غم سرک کہ میں اِک نظر صفِ دشمناں کو تو دیکھ لوں
ابھی کتنے لوگ کمیں میں ہیں ابھی کتنے تیر کماں میں ہیں

وہ جو منتخب تھے زمانے کے کبھی اپنے آپ میں چھپ گئے
جنھیں پوچھتا بھی نہ تھا کوئی وہ گروہِ معتبراں میں ہیں

نہ ہے ذہن و دل سے معاملہ نہ خیال و خواب سے رابطہ
یہ اسیر اپنے شکم میں ہیں، نہ یقیں میں ہیں نہ گماں میں ہیں

یہ ڈرے ہوؤں کا مزاج ہے کہ نہ ذوق کوئی نہ ذائقہ
انھیں لطفِ صبحِ بہار کیا جو اسیر خوفِ خزاں میں ہیں

مرے شعر ہیں مرے آئنے کہ طلسم بندیٔ حرف ہیں
کبھی رُخ پہ ظلم کے داغ ہیں، کبھی دستِ ماہ وشاں میں ہیں

سرِ میکدہ جو خروش ہے کبھی باقرؔ آپ بھی دیکھیے
کبھی پیاسے اور کبھی نعرہ زن یہ ہنر بھی پیرِ مغاں میں ہیں

◆◆

ہم نے بھی گزاری ہے، ہاں اسی زمانے میں
دل زمیں جگانے میں، دردوغم بسانے میں

جانِ جاں وہ دن بھی اب قرض ہو گئے تم پر
صَرف جو کیے تم نے ہم کو آزمانے میں

اپنی کشتِ جاں ہم نے آنسوؤں سے سینچی ہے
نقدِ دل ادا ہو گا اب کے آبیانے میں

ہم نے رنجِ محرومی کس ہنر سے ڈھالا ہے
جاں فروغ نغموں میں دُکھ کے شادیانے میں

زیست آرزو مندی ورنہ فرق ہی کیا ہے
آس ٹوٹ جانے اور سانس ٹوٹ جانے میں

اپنی اپنی منزل پر سب پہنچ گئے اور ہم
رہ گئے دوراہے پر راستہ بتانے میں

عشق نے سکھائی ہے کیمیا گری باقرؔ
اب بناتے ہیں سونا دل کے کارخانے میں

◆◆

چہروں کو یہاں مسخ کیا آئینہ گر نے
یا ہم کو ڈرایا ہے خود اپنی ہی نظر نے

وحشت وہ کہ گھر چھوڑ کے صحرا کو نکل جائیں
گھیرا ہے مگر چار طرف اپنے ہی گھر نے

بدلا سفرِ شوق کو اِک کارِ زیاں میں
کچھ پستیِ ہمت نے تو کچھ گردِ سفر نے

منزل کی طلب کے لیے نعرے تو بہت تھے
منزل کی طرف رُخ نہ کیا راہگذر نے

بس خوف سے صف بستہ ہوئے سارے اندھیرے
کیا ان کو ڈرایا کسی اُمیدِ سحر نے!

خود میں بھی سنور جاؤں گا معنی کے اثر سے
لفظوں کو نکھارا ہے اگر میرے ہنر نے

باقرؔ کو تو جینے کے قرینے بھی نہ آئے
گلشن میں بھی کانٹے ہی چنے خاک بسر نے

◆◆

یادوں سے جو دل کو بھر لیا ہے
ہم نے اسے حفظ کر لیا ہے

قسمت میں نشاطِ درد کب تھا
یہ بھی ترے نام پر لیا ہے

ہم نے تری نعمتوں سے مولا
بس ذوقِ دل و نظر لیا ہے

دُنیا میں ہے لین دین یُوں بھی
گر درد دیا تو سَر لیا ہے

دی عشق نے سَر خوشی مگر قرض
پھر سُود ہی عُمر بھر لیا ہے

دل میں جو چہل پہل ہے اتنی
کس نے یہ اُجاڑ گھر لیا ہے

اوروں نے بھی دل لگائے باقرؔ
تم نے تو بہت اثر لیا ہے

◆◆

لفظوں میں اپنے بھید چھپانے پہ آ گیا
دل سا جری بھی حیلے بہانے پہ آ گیا

کتنے نظر فریب نظر رہے
دل کش بنا جو دل کے نشانے پہ آ گیا

ہلکی سی اک خلش تھی طرح دے گیا جو میں
دل رفتہ رفتہ شور مچانے پہ آ گیا

تھی کیسی بے قراری جاں تیرے ہجر میں
کیسا قرار تھا ترے جانے پہ آ گیا

دل کو ہوائے دہر میں اُڑنے کا شوق تھا
ہر پھر کے آخر اپنے ٹھکانے پہ آ گیا

تھا مدعی کا بھی مگر دل ہی مدعا!
پر نفس سانپ بن کے خزانے پہ آ گیا

لو اہلِ دل یہ خواب ہیں خوشبو کے رنگ کے
لو مَیں دکانِ شوق بڑھانے پہ آ گیا

لے لو یہ داغ حسرتِ دل ہیں یہ شعر ہیں
لو مَیں متاعِ درد لٹانے پہ آ گیا

باقرؔ سُنا ہے گھر سے نکلتا نہیں کہیں
کیا جانے کیسا وقت دِوانے پہ آ گیا

◆◆

ذائقوں کے قتل کے یُوں سلسلے جاری ہُوئے
بوزنے اس عہد میں اَدرک کے بیوپاری ہوئے

دیکھتے ہی دیکھتے کیا کیا دکانیں سج گئیں
گانٹھ ہلدی کی ملی جن کو وہ پنساری ہوئے

ظلم کا وہ زور ہے ہر فصل کڑوی ہو گئی
حرص کا وہ شور ہے سارے کنویں کھاری ہوئے

اب کہاں غیظ و غضب بس ایک جھنجھلاہٹ سی ہے
اب تو خالص جذبۂ دل سے بھی ہم عاری ہوئے

کارِ دل کیسا اُلجھ کر رہ گئے دُنیا میں لوگ
ولولے جتنے اُٹھے سب صرفِ بیکاری ہوئے

جو نہ بِک سکتے ہوں ان کی کب کوئی قیمت لگی
قیمتی ٹھہرے جو یکسر جنسِ بازاری ہوئے

ہو سکے تو آؤ کاندھا مار کر آگے بڑھو
ورنہ یہ سمجھو کہ اپنے آپ پر بھاری ہوئے

خونِ مظلوماں کے چھینٹے اپنے چہرے پر بھی ہیں
کچھ سزا ہم کو بھی آخر مجرم اقراری ہوئے

قتلِ باقرؔ ہو گیا ملتا نہیں کوئی گواہ
شاہدِ عینی تھے ہم پر صاف انکاری ہوئے

◆◆

جہاں میں رہ کے بھی ہم کب جہاں میں رہتے ہیں
مکاں کو چھوڑ چکے ہیں زماں میں رہتے ہیں

ترے خیال میں اپنا گزر نہیں ہوتا
جو دل سے گر گئے وہم و گماں میں رہتے ہیں

تجھے غبار تو نام و نشاں ہمارا ملے
کہ ہم تو گردِ پسِ کارواں میں رہتے ہیں

جو خار ہیں وہ کھٹکتے ہیں چشمِ اعدا میں
جو پھول ہیں وہ دلِ دوستاں میں رہتے ہیں

شگفتِ جاں کے لیے کھینچ رنجِ محرومی
بہار کے سبھی موسم خزاں میں رہتے ہیں

نہیں جو وہ تو در و بام کی فضا سے ملو
ہمیں کے رنگِ طبیعت مکاں میں رہتے ہیں

ہم اپنی آگ کو پانی میں ڈھالنے کے لیے
طلسم کاریِ آہ و فغاں میں رہتے ہیں

عروجِ عشق، یہ دیکھا کہ تیرے دیوانے
زمیں پہ چلتے ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

کتابِ حال میں باقرؔ کو ڈھونڈتے ہو عبث
سُنا ہے دل کی کسی داستاں میں رہتے ہیں

◆◆

گزاری ہم نے بھی بے نام و بے نشاں ہی سہی
نہیں جو سُرخیِ تاریخ داستاں ہی سہی

مسافرانِ طلب میں شمار ہو کہ نہ ہو
چلے تو ہم بھی پسِ گردِ کارواں ہی سہی

قدم بڑھانے کو تھوڑی سی راہ بھی ہے بہت
زمین تنگ ہوئی خیر آسماں ہی سہی

اِک اُس کی سحر نگاہی، اک اپنا حُسنِ کلام
تمام عُمر کا حاصل ہے یہ زیاں ہی سہی

کبھی کریں کرمِ بے حساب کا بھی حساب
جنابِ شیخ مشیت کے رازداں ہی سہی

کبھی تو خود سے ملو اپنا حال بھی پوچھو
جنوں پسند طبیعت پہ یہ گراں ہی سہی

یہاں تو ایک نظر کا سوال ہے باقرؔ
انھیں یقینِ وفا ہو نہ ہو گماں ہی سہی

◆◆

مرے شعر ہیں مرے آئینے کہ طلسم بندیِ حرف ہیں
کبھی رُخ پہ ظلم کے داغ ہیں، کبھی دستِ ماہ وشاں میں ہیں

غیر مطبوعہ و مطبوعہ غیر مدوّن کلام

بسری یادیں، بھولے چہرے، ٹکڑے ٹوٹے خوابوں کے
بیتے دنوں کے ڈھیر میں ہوں گے ڈھونڈ کے ان کو لائے کون

سجاد باقر رضوی۔ شاعر اور انسان

دنیائے ادب میں سجاد باقر رضوی کو شاعر، ادیب، استاد اور نقاد کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے لیکن ان سے قریب رہنے والے اور وہ لوگ، جو اُن کی شخصیت سے متاثر ہیں، جانتے ہیں، وہ ایک عظیم المرتبت انسان بھی تھے۔ ان میں مروت، محبت، عقیدت اور جذبۂ قربانی حد درجہ موجود تھا۔ انھیں کوئی کتنا ہی نقصان پہنچاتا وہ مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے تھے جس سے محبت کرتے اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک خواہش پر تن من دھن لٹانے کو تیار رہتے۔ پروفیسر کرّار حسین صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جب بھی کراچی آتے اُن سے ملنے ضرور جاتے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو بے چین ہو جاتے اور ہر ممکن کوشش کرتے کہ سکون مل جائے۔ یہاں تک کہ دوسروں کے عذاب خود جھیلنے کو تیار ہو جاتے۔

ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تین اور چار سال کی عمر میں شعر موزوں کر لیتے۔ لوگ ان سے ازراہِ مذاق شعر کہلوا کر لطف اندوز ہوتے۔ ایک مرتبہ گاؤں (رودھولی) سے بڑے بابا آئے۔ سب نے ان سے کہا شعر کہہ دو۔ انھوں نے فوراً الفاظ ملا کر موزوں کر دیا۔ شعر یہ ہے:

رودھولی سے بڑے بابا ہیں آئے دیکھ لو تم بھی
یہ مجلس اس کی ہے جس نے صبح کو اطلاع دی تھی

بڑے بھائی اسکول سے آ کر انھیں اپنا سبق سنایا کرتے۔ انھیں اس طرح ذہن نشین ہو جاتا کہ وہ خود بھی اسے ہر لائن پر انگلی رکھ کر پڑھتے۔ بزرگوں نے بتایا کہ لوگ انھیں "ذہین" کہتے تھے۔ بڑے قناعت پسند تھے۔ نہ کبھی کسی چیز کی خواہش کی نہ کبھی کسی چیز کے لیے ضد۔ اگر کچھ روپے ملتے تو اس سے فوراً کتابیں خرید لیتے۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے لیکن بڑی ذمہ داری سے سب کا خیال رکھتے تھے۔ کلرکی کے زمانے میں سب تنخواہ اماں کو دے کر روپے بچا لیتے۔ ایک دن ایک بزرگ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے انھیں فوراً ادب سے سلام کیا۔ چائے پلائی اور کچھ رقم چھپا کر انھیں دی۔ انھوں نے دعائیں دیں اور کہا "مان کا پان بھلا" اور چلے گئے میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ان کے پرائمری اسکول کے استاد تھے۔ اس وقت بھائی انگلش میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ اپنی قناعت پسندی کا انھوں نے خود ایک شعر میں اظہار کیا ہے۔

خواہش پہ مجھے ٹوٹ کے گرنا نہیں آتا
پیاسا ہوں مگر ساحل دریا پہ کھڑا ہوں

سجاد باقر رضوی ظاہر بہ ظاہر مذہب پرست نہیں تھے۔ کیونکہ وہ اس مذہب کے قائل نہیں تھے کہ جسے زبانی دہرایا جاتا ہے۔ وہ ایسے مذہب کے قائل تھے جو انسانی معاشرے کی بھلائی چاہتا ہے اور برائیوں کو ختم کرتا ہے۔ انھیں خدائے عز و جل پر بہت یقین تھا۔ وہ کہتے ہیں:

میں کیا ہوں سخن کیا یہ تری دین ہے مولا
ہے مدح کے ہر لفظ میں تائید خدا کی

سجاد باقر رضوی اللہ اور اس کے رسول کو تہِ دل سے ماننے والے تھے۔ اللہ کی بھیجی کتابوں اور اس کے رسولوں پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

مجھے عزیز ہیں دونوں کہ ایک جام سے ہیں
خمارِ قبلۂ اوّل سرورِ کعبۂ دیں

وہ پیغمبر اسلامؐ کے اہلِ بیت سے عقیدت رکھتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام کے لیے

کہتے ہیں:

نیزے پہ سر بلند ہے یعنی وہ حق پسند ہے
رفعتِ معنیٔ کتاب اہلِ کتاب دیکھنا

....

میری کشیدِ جاں میں ہے بوئے ولائے اہلبیت
نقشۂ رمزِ کربلا بند مرے سبو میں ہے

....

دل کی راہوں میں نشانِ کربلا مل جائے گا
بس اسی رستے پہ چل آگے خدا مل جائے گا

اس شعر میں شہادت امامِ حسین علیہ السلام کا مقصد اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو قربانی دی گئی اس کا تذکرہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ راہِ حق حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ قربانی دینی پڑتی ہے۔

سجاد باقر رضوی نے بارہ سال کی عمر سے غزلیں کہنا شروع کیا لیکن باقاعدہ اس طرف مائل نہیں ہوئے۔ جب وہ اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے تو غزلوں اور نظم کی طرف توجہ دی۔ ان کی ایک نظم (جو مجھے تلاش کے باوجود نہیں مل سکی) جس کا عنوان تھا ''بچھی شیروانی''، یہ نظم اسلامیہ کالج کراچی کے میگزین میں شائع ہوئی تھی۔

سجاد باقر رضوی نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت، رباعیات اور غزلیں وغیرہ۔ ۱۹۵۱ء سے ان کی شاعری ایک سلسلے سے شروع ہوئی۔ ابتدائی غزلوں میں فن کی پختگی نہیں ملتی۔ کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کسی حادثاتی واقعات سے متاثر ہو کے غزلیں کہی ہیں کیونکہ کہیں تخلص نیر (جو گھر میں کہے جاتے تھے) کہیں فہیم (یہ تخلص بہت شروع کا ہے) اور بہت سی جگہوں پر کوئی تخلص نہیں۔ وہ الفاظ سے زیادہ معنی

پر توجہ دیتے ہیں۔ جب معنویت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں تو کہیں الفاظ ثقیل بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ اکثر شعرا کو بہت پسند کرتے تھے۔ مجھ سے کہتے مصحفی کو پڑھا کرو۔ لیکن وہ کسی خاص شاعر سے متاثر نظر نہیں آتے۔ ان کا اپنا الگ رنگ تھا۔

بھائی بہت سچے انسان تھے۔ وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتے تھے جب تک کسی کو اچھی طرح پرکھ نہیں لیتے اس کے متعلق رائے نہیں قائم کرتے تھے۔ اپنے خلوص کی وجہ سے لوگوں سے اکثر دھوکا کھاتے تھے۔

کراچی آئے ہوئے تھے بڑے بھائی سے ملنے جانے لگے تو میں نے کہا بھائی جان کی طبیعت خراب ہے۔ ان کی ہر بات صرف سنیے گا اور ان کے خلاف نہیں بولیے گا۔ (دونوں بھائی سیاسی معاملات میں قدرے اختلاف رکھتے تھے) واپس آئے تو کہنے لگے دیکھو بھائی جان میرے سامنے ہی میرے مخالفین کی تعریف کر رہے تھے لیکن تم نے منع کیا تھا اس لیے میں کچھ نہیں بولا۔ صرف ان کی سنتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ خود اپنی موت کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں کیونکہ وہ اپنی بیماری یا کوئی پریشانی کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔

سجاد باقر رضوی کا جو غیر مطبوعہ کلام تھا اسے جمع کرنے میں میں نے عاصمہ اصغر صاحبہ کی مدد کی ہے۔ عاصمہ اصغر صاحبہ نے بھی بہت دل جمعی سے کام کیا ہے۔ ان کا بقیہ کلام جو رہ گیا ہے اسے میں تلاش کرنے کے بعد عاصمہ اصغر صاحبہ کو فراہم کردوں گی۔

تہذیب سجاد

تہذیب سجاد

یکم اگست ۲۰۱۰ء

◆◆◆

زمزمۂ توحید

اے خالق ذوالجلالِ والاکرام
ہیں تیری ہی شان کے یہ سب کام
اے قادرِ مطلقِ زمانہ
ہے تیرا ہی یہ سب کارخانہ
ان میں جب یہ ہے دستکاری
ہو گی کیا کچھ نہ شانِ باری
کیا ہو سکے ہم سے حمد تیری
سبحان اللہ ذات تیری
عرش و کرسی و چرخِ اخضر
محکوم ہیں سب ترے سراسر
صنعت کا تری جہاں یہ سارا
ادنیٰ سا ایک ہے کرشمہ

گو ہم نے نہ تجھ کو اس میں دیکھا
پایا بھی تو کچھ یونہی سا پایا
پر تیرا جلال و عظمت و شاں
ذرّے ذرّے سے ہے نمایاں
باہر جو مقال سے ہے، تُو ہے
برتر جو خیال سے ہے، تُو ہے

بولو اے چاند اے ستارو
اے عرشِ بریں کے راز دارو
تم مظہرِ شانِ کبریا ہو
تم آئینۂ قدرتِ خدا ہو
تم دیکھتے ہو جلالِ حضرت
کرتے ہو طوافِ تختِ عزت
ہیں ذوق میں حمد کی سراسر
توحید کے زمزمے زباں پر

●●

حمد

افلاک و زمیں کے رہنے والو
مل کر ہم تم ایک زباں ہو
ظاہر و باطن کہ اوّل و آخر
جاری رہے حمدِ حق زباں پر

سب تاروں میں اے چمکتے تارے
آتا ہے جو شب کو سب سے پیچھے
گو تجھ کو لگاؤ رات ہی کا
تو دن کی ہے اک دلیلِ بیضا
پر پھرتا ہے نور سے درخشاں
جیب و دامانِ صبحِ خنداں
آثارِ سحر عیاں ہوں جس دم
ہے نور سرور کا جو عالم
ہو اپنے مدار میں بصد شاں
ذکرِ معبود میں تو رقصاں

اے مہرِ منیر صاحبِ شان
جسمِ عالم کی چشم اور جان
اس گردشِ دائمی میں جس آن
نکلے تو اُفق سے ہو کے تابان
یا وسطِ فلک پہ ہو چمکتا
یا جانبِ غرب ہو ڈھلکتا
لکھ خامۂ نور سے سراسر
صفحاتِ فلک پہ حمدِ داور

اے انجم و ماہ نور افشاں
سیارہ و ثابتِ درخشاں
یہ رقص و طرب یہ وجد یہ حال
ہے اس کے وفورِ عشق پہ دال
کُن سے جس نے کیا اُجالا
ظلمت سے ہے نور کو نکالا

◆◆

نعت

مولا ترا ظہور حقیقت کی جان ہے
باقی تو سب طلسم ہے یا داستان ہے

اے آنکھ ڈھونڈ حرفِ ثنائے رسولؐ پاک
اے دل سنبھل کہ آج ترا امتحان ہے

کس کی ہوائے زلف لیے پھرتی ہے ہوا؟
اب کس سے پوچھیے کہ وہ خود بے زبان ہے

دیوانہ وار گردشِ سیارگاں ہے کیوں؟
طرفِ زمیں جھکا ہوا کیوں آسمان ہے؟

کس کی ادائے خاص ہے بجلی کو اضطراب؟
تابش سے کس کے نور کی ذرّوں میں جان ہے؟

کس کے قدم کی خاک متاعِ زمین ہے؟
رحمت کا کس کی ذکر قیامِ زمان ہے؟

ہے کس کی بندگی میں خدائی کی آن بان؟
"بعد از خدا بزرگ" بھلا کس کی شان ہے؟

لوحِ جبیں پہ نقش ہو خاکِ رہِ رسولؐ
دنیا پہ خاک، بس یہی دیں کا نشان ہے

باقرؔ ہم اپنے اشکِ ندامت کسے دکھائیں
بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ مہربان ہے

نعت

زباں پہ نامِ مبارک اگر تمھارا ہوا
تو یہ صحیفۂ دل شوق کا شمارا ہوا

ہے ایک اسمِ محمدؐ تمام مرکزِ شوق
اسی سے عشق کا ہر قصہ استعارا ہوا

کبھی یہ وقت رُکا آفتاب پلٹا ہے
یہ کس کی چشمِ زماں زیب کا اشارا ہوا

تمام فاصلہ ہائے مکاں مسخر تھے
قیام فاصلہ دو کماں گوارا ہوا

اسی سے دل میں تموج بھی ہے سکون بھی ہے
وہ اسم جو مرا دریا بنا کنارا ہوا

بلائیں چار طرف سے ہمیں ڈراتی رہیں
ترے حصار میں تجھ یہ بڑا سہارا ہوا

چراغ دل میں جلے، پھول راستوں میں کھلے
ترا کرم مرے مولا عجب نظارا ہوا

یہ نعت ہے کہ ہے اک آسمانِ نو کی نمود
ابھر کے حرف کوئی چاند کوئی تارا ہوا

ملے گی چھوٹ ولائے نبیؐ کی بھی باقرؔ
کبھی جو پیش گناہوں کا گوشوارا ہوا

◆◆

نعت

مولا یہ میرا عجزِ بیاں تو ضرور ہے
لیکن جو دل کی بات ہے بین السطور ہے

کھلتے ہیں بات بات میں فکرِ سخن کے پھول
خوشبو بسی ہوئی ہے کہ ذکرِ حضورؐ ہے

تفسیرِ اسمِ پاکِ محمدؐ ہے کائنات
اوپر جو نور ہے وہی نیچے ظہور ہے

راز و نیاز خاص کو معراج چاہیے
ہاں عام گفتگو کے لیے کوہِ طور ہے

ہم سرکشیدہ فخرِ غلامی سے آپ کی
غیروں کو اس ادا پہ گمانِ غرور ہے

کیا منہ کریں جو آپ کے دامن کی آرزو
مولا یہ دل تو بارِ خجالت سے چُور ہے

باقرؔ سا گنہ گار پھرے خوار حشر میں
یہ بات بھی تو آپ کی رحمت سے دُور ہے

◆◆

نعت

مجھے ہے نشۂ جامِ ولائے سرورِ دیں
کہو کہ اب غمِ دنیا نہ آئے میرے قریں

فلک اٹھا نہ سکا بوجھ ایک آدم کا
زمیں پہ خلق ہوئے کیسے عرش مکیں

یہ چاند تاروں کی محفل سنورتی کس کے لیے
جو آسمان کو زینت نہ دیتے اہلِ زمیں

مجھے عزیز ہیں دونوں کہ ایک جام سے ہیں
خمارِ قبلۂ اوّل سرورِ کعبۂ دیں

مرے حضورؐ کوئی روشنی کہ قطع ہو شب
گھرا ہے وہم کی تاریکیوں میں نورِ یقیں

یہ عہد، عہدِ خرافات و کم عیار و زبوں
یہاں ہیں جہل کے قانون و مکر کے آئیں

یہاں ہیں شیر گرفتارِ پنجۂ روباہ
یہاں پہ مانگتے ہیں رزق زاغ سے شاہیں

حضورؐ مجھ کو عطا ہو وہ سرفرازیِ شوق
جھکے نہ جھوٹے خداؤں کے سامنے یہ جبیں

وہ استقامتِ راہِ وفا کہ جس میں رہے
ہر اک فریبِ ہوس کے لیے ہزار نہیں

بلند کیجیے دلوں سے ہمارے نعرۂ حق
کہ لا الٰہ کے پیغام کے ہمیں تھے امیں

ہمیں یہ بارِ امانت تھا آخری پیغام
ہمیں پہ بند ہوئی راہِ حق و صدق و یقین

تمھارے نام دل و جاں ہیں، تم محافظ ہو
ہزار دشمنِ جاں ہوں ہزار دشمنِ دیں

اسی طرح سے ہو طے میری راہِ شوق و مراد
ہو تم قدم بہ قدم اور میں جبیں بہ جبیں

میں سرفراز ہوں باقرؔ کہ نقشِ پائے حضورؐ
نصیب ہوں گے مجھے حشر تک کہیں نہ کہیں

◆◆

نعت

کائنات انگشتری اور نورِ حق خاتم بنا
میرے مولا تیری زیبائی کو یہ عالم بنا

پاؤں کے نیچے کی مٹی بن گئی خاکِ شفا
نور کا پرتو پڑا جب خاک پر، آدم بنا

رحمتِ عالم کا سایہ تھا مقدر پر مرے
گو تسلسل سے بگڑتا تھا مگر پیہم بنا

خاکِ بطحا جامِ عرفانِ حقیقت کی نمود
خود پرستی کا جو آئینہ تھا جامِ جم بنا

طاقتِ ایماں نے دی میرے گناہوں کو شکست
وسوسوں سے لڑتے لڑتے اور مستحکم بنا

گلستاں ویران، آنکھیں خشک ہیں مولائے کل
پھر ہمیں سرسبز کر، آنسو بنا، شبنم بنا

میری ویرانی کو تھی آب و ہوا حبِّ رسولؐ
کشتِ دل کے واسطے بادل بنا موسم بنا

میری بربادی پہ اِک عالم کی نظریں ہیں لگی
میرے مولا میری خاکستر سے اِک عالم بنا

میری فطرت کے تقاضوں سے سوا ہے میرا درد
تیری رحمت کا تقاضا ہے کہ اب مرہم بنا

صدقِ دل سے جس نے کی تصدیقِ معراجِ رسولؐ
وہ فرازِ زندگی کے راز کا محرم بنا

شاہِ بطحا کی غلامی کا ہے باقرؔ یہ شرف
میں بگڑ کر بھی حریفِ گے، حریفِ جم بنا

◆◆

نعت

رحمت تمہارا نام شفاعت تمہارا نام
پروردگار اسمِ محبت تمہارا نام

اپنی سیاہ بختی و ایام تلخ میں
آنکھوں میں نور، لب پہ حلاوت تمہارا نام

نورِ خدا کا جسمِ مظہر تمہاری ذات
قائم نشانِ راہِ حقیقت تمہارا نام

دینِ مبیں حقیقتِ برحق کی ہے دلیل
دائم وجودِ حق پہ شہادت تمہارا نام

انسانیت کو اوجِ شرف ہے تمہاری راہ
رحمت تمہارا ذکر، عبادت تمہارا نام

ہے بندہ و خدا کا تعلق تمہاری ذات
حق کے لیے دلیلِ اطاعت تمہارا نام

بے چارگاں کے واسطے تم رحمتِ تمام
زخمی دلوں کے واسطے راحت تمہارا نام

بیمارِ زندگی کو شفا ہے تمہارا ذکر
آیا زباں پہ بہرِ عیادت تمہارا نام

باقرؔ تو شرمسار بہت ہے، مگر زباں
کرتی ہے وِرد، روزِ قیامت تمہارا نام

◆◆

نعت

پھولا پھلا یہ باغِ تمنا تمھیں سے ہے
آنکھوں میں نور، دل میں اُجالا تمھیں سے ہے

بعد از خدا بزرگ ہو تم قصہ مختصر
ہو تم ہی وجہِ خلق، یہ دنیا تمھیں سے ہے

بےکس کی آس، چارۂ بے چارگاں ہو تم
ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا تمھیں سے ہے

معراج، اِک علامتِ ایمان و آگہی
ایمان و آگہی کا یہ رشتہ تمھیں سے ہے

اللہ رے شرف کہ خدائی گلے لگائے
یہ بندگی کا رتبۂ اعلیٰ تمھیں سے ہے

تم نورِ کائنات ہو ہر شے میں جلوہ ریز
ہر صورتِ وجود میں معنا تمھیں سے ہے

وہ روشنی کہ طور سے دل تک ہے موجزن
وہ مستعار برقِ تجلا تمھیں سے ہے

تم نے نظر جو پھیر لی، صحرا ہے خشک لب
لب ریز ہے کہ سیریِ دریا تمھیں سے ہے

مسند نشینِ خلق ہو تم، تم پہ ہر سلام
تقلیمِ جہانِ کُن مرے مولا تمھیں سے ہے

تم سے ہی نسبتیں ہیں خلیلؑ و حسینؑ کی
مضبوط رسمِ شوق کا رشتا تمھیں سے ہے

باقرؔ تمھارے در کے غلاموں کا ہے غلام
شاہوں کی ہم سَری کا یہ رُتبا تمھیں سے ہے

◆◆

نعت

کس منہ سے کروں مدحِ رسولؐ دوسرا کی
دل سے مگر اٹھتی ہے صدا صلِّ علا کی

ہم نے بھی کسی اور کے در پہ نہ صدا کی
اب تو ہی سُنے یا نہ سُنے اپنے گدا کی

بادل تری رحمت ہے ہوا تیری عطا ہے
بیمار کو اب فکر ہو کیا آب و ہوا کی

کونین نہ لو خاکِ درِ پاک سمیٹو
کہنے کو تو مٹی ہے پہ اکسیر بلا کی

بعثت ہے زمیں پر تو ہے معراج فلک پر
توقیر برابر ہی رہی ارض و سما کی

یہ معجزہ دنیا نے نہ دیکھا نہ سنا ہے
کس طرح ڈھلا نور میں اک پیکرِ خاکی

میں کیا ہوں سخن کیا ہے تری دین ہے مولا
ہے مدح کے ہر لفظ میں تائید خدا کی

لکھتے ہوئے ہر حرف میں اک لہر سی دوڑی
دل میں ہوئی تحریک اگر تیری ثنا کی

لفظوں میں کھنچے معنیِ آدابِ محبت
گرمی مرے جذبات میں ہے تیری وِلا کی

یاں ہجر کے دکھ آنکھ میں واں پیار کے انداز
یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کی، وہ سنا کی

اس نعت سے شاداب زمیں دل کی ہے باقرؔ
خوشبو کی کہیں لہر، کہیں موج صبا کی

◆◆

سلام

کرب و بلا کے ضمن میں دل کا نصاب دیکھنا
کھول کے شوق کی کتاب عشق کا باب دیکھنا

اہلِ جفا کو موجِ آب، موجِ رواں ہے زندگی
اہلِ وفا کی زندگی نقش بر آب دیکھنا

ان کی طلب کہ سَر جھکے ان کی خوشی کہ سَر کٹے
ان کا سوال دیکھنا، ان کا جواب دیکھنا

نیزے پہ سر بلند ہے، یعنی وہ حق پسند ہے
رفعتِ معنیِ کتاب، اہلِ کتاب دیکھنا

اہلِ خرد کا یہ جہاں، کتنا حقیقت آشنا
اہلِ طلب کی کائنات، خواب ہی خواب دیکھنا

تشنگی ایک آگہی، آگہی عین زندگی
خواہشِ آب پہ قدم ایک سراب دیکھنا

لائے ہیں چھانٹ کر حسینؑ سارے نمونۂ کمال
جرأت شیب دیکھنا، زورِ شباب دیکھنا

بُرشِ تیغ الاماں نہر پہ قہر کا سماں
قلزمِ خوں میں غرق مشکِ حباب دیکھنا

تیر گلے پہ کھائے گا خون میں یہ نہائے گا
ہمتِ طفلِ شیرخوار اُمِّ رباب دیکھنا

ہائے یہ شامِ کربلا، بے کسیِ میرِ قافلہ
بجھتے خیام دیکھنا، جلتی طناب دیکھنا

باقرِ خستہ تن کو سَر ایک وبالِ دوش ہے
میرے امام اک نظر حالِ خراب دیکھنا

◆◆

سلام

شوق کی منزلوں میں دل راہ بھی رہنما بھی ہے
چل یہی راہِ بندگی اس میں کہیں خدا بھی ہے

ہجر کی کلفتیں نہ پوچھ، وصل کی لذتیں نہ پوچھ
پیاس کی آگہی بھی ہے، آس کی کربلا بھی ہے

عشق دلوں کی واردات، عشق سے منکشف حیات
آپ ہی خوں بہائے ہے آپ ہی خوں بہا بھی ہے

آنکھ میں خونِ دل کی دھار دل میں ہے عزمِ پائیدار
ذکرِ شہادتِ حسینؑ درد بھی ہے دوا بھی ہے

راہِ حسینؑ سے ملا راہِ نجات کا پتا
باغِ بہشت سے ادھر، منزلِ کربلا بھی ہے

ہے یہ سفرِ حسینؑ کا سلسلہ ہائے انتہا
جبر کی انتہا بھی ہے، صبر کی انتہا بھی ہے

ظلمتِ شام کا جواب، مہرِ صداقتِ حسینؑ
نوکِ سناں پہ سربلند حق نما بھی ہے

حشر کے دن غلامیِ ختمِ رسلؐ ہے اک شرف
تِپسا ولائے اہلِ بیت ہم کو یہ آسرا بھی ہے

شہر کے درد کو لیے درد کے شہر کی طرف
خاک بہ سَر، برہنہ پا، باقرؔ مبتلا بھی ہے

◆◆

سلام

سرد آہوں کی فضا، غم کی گھٹا بھی چاہیے
شہرِ دل کے واسطے آب و ہوا بھی چاہیے

دے رہا ہے یہ پیامِ زندگی خونِ حسینؑ
راہِ حق میں منزلِ کرب و بلا بھی چاہیے

کوچہ و بازار میں تشہیرِ آلِ مصطفیٰؐ
بانیانِ ظلم کچھ خوفِ خدا بھی چاہیے

حرملہ کے سامنے اصغرؑ کو لاتے ہیں حسینؑ
تیر ایسا ہو تو پھر ایسا گلا بھی چاہیے

لکھ گئے ہیں خوں سے یہ تحریر اصحابِ حسینؑ
زندگی میں پاسِ آئینِ وفا بھی چاہیے

اللہ اللہ منہ نہ دریا کو لگایا پیاس میں
تشنگی نازاں ہو ایسا حوصلا بھی چاہیے

جنگ جو دو دو لڑے خود سے بھی اور دشمن سے بھی
فوجِ حق میں حُر سا اک جنگ آزما بھی چاہیے

درد کی باتیں بہت ہیں کربلا کے غم کے ساتھ
ساتھ سننے کے دلِ درد آشنا بھی چاہیے

دل میں باقرؔ الفتِ آلِ عبا کے ساتھ ساتھ
آنکھ میں نم، سر پہ خاکِ کربلا بھی چاہیے

◆◆

سلام

رزم گہِ حیات میں عزمِ جواں ہے کربلا
عقل کے کاروبار میں دل کی زباں ہے کربلا

شوق کی آرزو ہے یہ ذوق کی آبرو ہے یہ
گنجِ کمالِ زیست کا سرِّ نہاں ہے کربلا

گلشنِ زیست کے لیے فصلِ بہار آگہی
خرمنِ ظلم کے لیے برقِ تپاں ہے کربلا

راہِ حسینؑ سے ملا باغِ بہشت کا پتا
صدق و یقیں کی راہ میں قطعِ گماں ہے کربلا

نامِ یزید گمرہی کارِ حسینؑ آگہی
معنیٔ دل کے واسطے طرزِ بیاں ہے کربلا

اہلِ طلب کو ہے یہی مرگِ وسیلۂ حیات
زندگیِ دوام کا نام و نشاں ہے کربلا

گلشنِ آرزو میں ہے جوئے ولائے اہلِ بیت
کشتِ خیال کے لیے آبِ رواں ہے کربلا

باقرؔ اب اس مقام کو مرکزِ آگہی بنا
تیرگیِ حیات میں نور فشاں ہے کربلا

◆◆

سلام

سلام تم پہ شہیدانِ آستانِ وفا
تمہاری یاد سے آباد ہے جہانِ وفا

تمہارے عزم سے ہے بزمِ دل میں گرمیِ شوق
تمہارے خوں سے ہے تالیفِ داستانِ وفا

تمہارے خوں سے ہے رنگیں قبائے لالۂ دل
تمہارے خوں سے مہکتا ہے بوستانِ وفا

تمہارے کام سے نکلی ہے راہ و رسمِ جنوں
تمہارے نام سے پاکیزہ ہے زبانِ وفا

حسینؑ لعل و جواہر لٹانے آئے ہیں
کھلے گی چشمِ بصیرت پہ آج کانِ وفا

نبیؐ کی آل سے شرمندہ تھی جو نہرِ فرات
لہو کی موج چڑھی بہرِ امتحانِ وفا

خود آج بیچ کے خنجر کی دھار پر رگِ جاں
متاعِ درد خریدیں گے کشتگانِ وفا

صدائے آخر ''ھل من مغیث'' ڈوب گئی
کہ اہلِ کوفہ میں تھا کوئی نکتہ دانِ وفا

ہیں پیکرانِ وفا بستہ رسن سرِ شام
لٹا ہے دشتِ غریبی میں کاروانِ وفا

ہوئی تھی اس کی شہیدوں کے خوں سے سیرابی
خزاں نے رُخ نہ کیا سوئے گلستانِ وفا

بھٹک سکیں گے نہ اب رہروانِ منزلِ شوق
رہِ حیات میں ہے کربلا نشانِ وفا

مرا سلام امامِ انام کیجیے قبول
ہیں آپ جانِ طلب، جانِ عشق، جانِ وفا

◆◆

سلام

دل کی راہوں میں نشانِ کربلا مل جائے گا
بس اسی رستے پہ آگے چل، خدا مل جائے گا

کیوں بھٹکتا ہے سرِ راہِ نشاطِ زندگی
درد کی وادی میں آ، درد آشنا مل جائے گا

پتھروں کی زد میں بیٹھا آئینہ سازی نہ کر
کیا ملا اب تک مرے دل اور کیا مل جائے گا

حق نما ہے مشعلِ خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ
گھپ اندھیروں سے نہ گھبرا، راستہ مل جائے گا

رات بھر کی کشمکش تھی راہِ جنت کی کشاد
حُر کو کیا معلوم تھا یہ مرتبہ مل جائے گا

عشق کی ہر راہ جاتی ہے شہادت گاہ کو
آگے بڑھ، پہلا قدم رکھ، حوصلہ مل جائے گا

عابدِ بیمار کے نقشِ قدم آنکھوں میں رکھ
ان کی زنجیروں سے تیرا سلسلہ مل جائے گا

خواہشِ سیرابیِ دل نے دکھائے ہیں سراب
تشنگی کی راہ چل آبِ بقا مل جائے گا

باقرؔ بے خانماں بن جا علی کے در کی خاک
یوں مٹا تو رتبۂ خاکِ شفا مل جائے گا

◆◆

سلام

سیراب رہنے والوں سے دنیا کو کیا ملا
پیاسوں سے راہِ آبِ بقا کا پتا ملا

افسانہ ہائے شوق ہیں عالم میں بے شمار
عنوان سب کا ایک وہی کربلا ملا

نیزے پہ بولتا ہوا قرآن دیکھنا
حق کو حق آشنا تو ہمیں حق نما ملا

ملّت ہے آج خونِ شہیداں سے سرخرو
ان کا لہو بہا تو اسے خوں بہا ملا

تم کو سلام راہِ طلب کے مسافرو
منزل تمھیں ملی تو ہمیں راستہ ملا

یہ آگہی مرگ تو وہ مرگِ آگہی
حق کو یہ راہ، ظلم کو وہ راستہ ملا

یکساں ہے مرگ و زیست پہ احسانِ کربلا
اس کو خودی کی آن تو اس کو خدا ملا

یادِ حسینؑ دل کے لہو سے تھی ہم کلام
بولا لہو تو ہم کو یہ طرزِ نوا ملا

بندش ہے چست خوبیِ مضموں کے ساتھ ساتھ
باقرؔ کو یوں بھی حبِّ علیؑ کا صلہ ملا

◆◆

سلام

عجب ہے ماہِ عزا میں ہلال کی صورت
نگوں ہے سَر تو ہے یکسر ملال کی صورت

جلے ہیں دھوپ میں گل، آندھیوں میں گل ہیں چراغ
نہ موسموں میں رہی اعتدال کی صورت

زمین تنگ ہوئی ہے وفا شعاروں پر
بدل گئی ہے بہت ماہ و سال کی صورت

سپہرِ دیں کے مہ و مہر ہیں زمیں کا فروغ
کوئی جمال کی، کوئی جلال کی صورت

کھلا ہے دشت میں کیسا یہ بوستانِ بتولؑ
کوئی ہے گل کی تو کوئی نہال کی صورت

نہیں ہے حق کے گواہوں میں رنگ و نسل کا فرق
کوئی نبیؐ کی تو کوئی بلالؓ کی صورت

لہو کے ساز پہ آوازِ حق کا نغمۂ جاں
ہے زندگی کے ہنر میں کمال کی صورت

اٹھا کے ہاتھ پہ اصغر کو سر جھکائے ہوئے
حسینؑ ہیں سرِ میداں سوال کی صورت

رگِ گلوئے حسینؑ اور تیغِ شمرِ لعیں
زوالِ عصر ہے، عصرِ زوال کی صورت

حسینؑ مہرِ صداقت کی روشنی کا طلوع
یزید ظلمتِ شب کے مآل کی صورت

حضورِ شافعِ محشر پہنچ گیا باقرؔ
گناہ سر پہ لیے انفعال کی صورت

◆◆

سلام

کرب و بلائے عشق بھی شوق کی جستجو میں ہے
تابش و آبِ تیغ بھی زیست کی آبرو میں ہے

پیاس کی آگہی سے ہے رازِ حیات آشکار
آبِ بقائے عاقبت موت کی آرزو میں ہے

آج بھی ہے بسا ہوا اس سے جہانِ آرزو
خونِ حسینؑ کی مہک منظرِ رنگ و بو میں ہے

آج بھی ہے فراتِ جاں موج بہ موج خوں فشاں
تشنہ لبی کی لہر بھی زیست کی آبجو میں ہے

موت بھی سربلند ہے زیست بھی سربلند ہے
سرخیٔ داستانِ جاں سب مرے سرخرو میں ہے

ریگِ زمینِ کربلا کشتیِ دیں کی پاسباں
رازِ بہارِ جاوداں خونِ رگِ گلو میں ہے

میری کشیدِ جاں میں ہے نوحۂ دودمانِ اہلِ بیت
نغمۂ رمزِ کربلا بندِ مرے سبو میں ہے

ہے تنِ پاک زخم زخم کلمۂ حق کا ترجماں
سرد جو اپنے دل میں ہے گرم وہ اس لہو میں ہے

گرم ہے ماتمِ حسینؑ دل کو نہیں کسی کے چین
باقرِؔ بے نوا نجات بس اسی ہاؤ ہو میں ہے

◆◆

ترے تغافل سے ہے شکایت نہ اپنے مٹنے کا کوئی غم ہے
یہ سب بظاہر بجا ہے لیکن یہ آنکھ کیوں آج میری نم ہے

نئی اُمنگوں کو ساتھ لے کر، رواں ہوں پھر جادۂ وفا پر
مگر ہے احساسِ نامرادی کہ سہما سہما سا ہر قدم ہے

مری اُمیدوں کو روند کر اب مری خوشی کی ہے تم کو پروا
یہ کیا نیا روپ تم نے دھارا، یہ کیا کوئی نت نیا بھرم ہے

تمھیں وہ لمحے تو یاد ہوں گے کہ جب تمھیں یاد تھے یہ فقرے
"تمھیں مرے سَر کا واسطہ ہے تمھیں مری جان کی قسم ہے"

وہ مہرباں کیوں ہوئے ہیں مجھ پر وہ پوچھتے ہیں تو کہہ دو غیر• حضور زندہ ہوں، جی رہا ہوں بڑی نوازش بڑا کرم ہے

• سجاد باقر رضوی کو گھر میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

◆◆

حضور سوکھی ہڈیوں میں خون کی تلاش ہے
مرے حضور اس ادائے دلبری کو کیا کہوں

بڑھے ہیں جتنا آگے منزلوں سے اتنا دور ہیں
جو رہبری یہی رہی، تو رہبری کو کیا کہوں

ہے خشک زندگی میں خشک روٹیوں کا آسرا
میں شکریے کے ساتھ بندہ پروری کو کیا کہوں

ہے بت تراشیوں کے ساتھ مسلکِ براہمی
تو پھر بتایئے کہ رسمِ آزری کو کیا کہوں

میں خود تو اک کلرک ہوں خوش ہی رہوں بجا
یہ بھوکی ننگی قوم کی سپہ گری کو کیا کہوں

راہ نما انسانوں کے اس دور میں کچھ شیطان ہوئے ہیں
امن وامانِ دہر کی خاطر جنگ کے سب سامان ہوئے ہیں

تو نے بھی آنکھیں پھیری ہیں تو ہی بتا اب جائیں کہاں ہم
تیری غلط انداز نگہ پر تن من سے قربان ہوئے ہیں

راہِ طلب میں بہتیروں نے زلفِ پیچاں کے بل کھولے
حادثے کچھ ایسے بھی اس دنیا میں میری جان ہوئے ہیں

لوٹ میں گلشن کی کچھ جھگڑا عزّ و وقار کا بھی نکلا ہے
آخر کو صیاد کی ضد پر گل چیں کے بھی کان ہوئے ہیں

باغی گھیرا ڈال چکے ہیں مہراج● اس سے کیا حاصل ہے
دو دو روٹی بٹنے کے اب جاری جو فرمان ہوئے ہیں

● ریاست کے مالک "مہراج" کہلاتے تھے۔

خون چھلکتا ہے آنکھوں سے خون ٹپکتا ہے چہروں سے
جتنا منہ کو خون لگا ہے اتنے بڑے انسان ہوئے ہیں

جابر چوروں کی محفل میں لوٹ بٹیا پر اے قیصر
سنتے ہیں کچھ وعدے قسمیں کچھ عہد و پیمان ہوئے ہیں

◆◆

تپتے لوہے کی گرمی سے سونے گلتے جاتے ہیں
ڈالر کے گہنائے سورج خود ہی ڈھلتے جاتے ہیں

کل جو نغمے سرد دلوں کی آہ سے نکلا کرتے تھے
آج وہ تلواروں کی جھنکاروں میں بدلتے جاتے ہیں

کل تک جو بدبخت مسافر راہ میں تھک تھک جاتے تھے
آج وہ جادہ جادہ منزل منزل چلتے جاتے ہیں

کل تک جو دل کے دل ہی میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتے تھے
تلواروں کی باڑھ سے وہ ارمان نکلتے جاتے ہیں

کل تک جو زلفوں کے خم میں ڈھونڈتے تھے قسمت کے پھیر
آج وہ جہدِ پیہم سے تقدیر بدلتے جاتے ہیں

آپ کی نازک پیشانی پر جتنے بھی بل پڑتے ہیں
آپ کے دیوانے اتنا ہی اور مچلتے جاتے ہیں

ختم ہوئی تاریکی تیرؔ آس کی کرنیں پھوٹ پڑیں
اب تو دل مایوس نہیں ہیں اب تو بہلتے جاتے ہیں

◆◆

پلکوں تک آ کے آنکھوں کے تارے ٹھہر گئے
یا سیلِ نظم و ضبط کے دھارے ٹھہر گئے

آؤ کہ بڑھ کے ان سے بھی آگے نکل چلیں
دیکھو، کہ تھک کے چاند ستارے ٹھہر گئے

جو جہد آشنا تھے وہ طوفاں سے جا ملے
پروردۂ سکون کنارے ٹھہر گئے

دیوانگی کا رقص بھی ہے اب قریب ختم
شاید ان انگلیوں کے اشارے ٹھہر گئے

اک لمحۂ سکون کی بے جا تلاش میں
تیری گلی میں درد کے مارے ٹھہر گئے

فریب تھا عقل و آگہی کا کہ میری فکر و نظر کا دھوکا
جو آخرِ شب کی چاندنی پر ہوا تھا مجھ کو سحر کا دھوکا

میں باغبانوں کی سازشوں کو، سیاستوں کو سمجھ چکا ہوں
خزاں کا کھا کر فریبِ پیہم اٹھا کے برق و شرر کا دھوکا

شعورِ پختہ کی خیر ہو جس نے زندگی کو بچا لیا ہے
تری نگاہِ کرم نما نے دیا تو تھا عمر بھر کا دھوکا

دعاؤں کو ہاتھ اٹھا رہا ہوں یہ خود فریبی ملاحظہ ہو
فریبِ تسکین کا برا ہو میں کھا رہا ہوں اثر کا دھوکا

دکھائی دیتی ہے مسخ تر حسین صورت بھی زندگی کی
قصور ہے آئینے کا اس میں کہ ہے یہ آئینہ گر کا دھوکا

◆◆

"ترا خیال مرے زخمِ دل پہ مرہم ہے"
یہی خیال مری زندگی کو کیا کم ہے

اُمنڈ کے آئیں گے آنسو جو حال پوچھو گے
ابھی رُکو، کہ ابھی آنکھ میری پُرنم ہے

مجھے ہے ناز بہت التفاتِ بے حد پر
جو وہ کہیں تو کہوں گا حضور کچھ کم ہے

ہزار پھول کھلے ہیں جو ایک مرجھایا
ثباتِ گل پہ بھلا کیوں چمن میں ماتم ہے

جو خود مٹی تو ہزاروں کو زندگی دے دی
بہت حسیں ہے اگر یہ شکستِ شبنم ہے

ابھی سے پھیر کے منہ چارہ ساز کیوں روئے
ابھی تو سانس ہے باقی ابھی تو کچھ دم ہے

کہیں پناہ بھی پاؤ گے بھاگ کر باقرؔ
غمِ زمانہ کی یورش ابھی تو پیہم ہے

◆◆

آپ کچھ کہتے زر نگاروں کی
ہم سے کچھ سُنتے دل فگاروں کی

کوئی افسانہ اور ہی چھیڑو
داستاں سن چکے بہاروں کی

ہم بھی سُنتے رہے نجانے کیوں
بات نکلی تھی غم کے ماروں کی

کچھ رسن بند اور آئے ہیں
پھر ضرورت پڑے گی داروں کی

دوپہر ہے، غم زمانہ ہے
بات ہی کیا کریں ستاروں کی

ہم ہیں جہد و عمل کے پروردہ
کیا ضرورت ہمیں سہاروں کی

طبع نازک پہ ہو گراں نہ کہیں
گفتگو یہ مرے اشاروں کی

◆◆

حاصلِ زیست عشق ہی تو نہیں
چشم و ابرو ہی زندگی تو نہیں

زُلفِ شب رنگ و چشمِ سحر انداز
یہ بہت کچھ ہیں پر یہی تو نہیں

میرے لب تک ترے تغافل کی
بات آئی مگر کبھی تو نہیں

آپ ناراض ہو گئے اتنا
یہ کوئی ایسی بات بھی تو نہیں

کٹ ہی جائے گی یہ بھی اے نیّر
ہجر کی رات دائمی تو نہیں

تجھ سے بچھڑ جاؤں یہ میں نے کبھی چاہا بھی نہیں
ہاں مگر تلخیٔ ایام سے ہارا بھی نہیں

میں تری بزم سے خود اٹھ کے چلا آیا ہوں
تو نے روکا بھی نہیں، تو نے اٹھایا بھی نہیں

ذہن و دل کس لیے مجروح نظر آتے ہیں
تو نے چاہا بھی نہیں، تو نے ستایا بھی نہیں

یہ کڑی دھوپ غمِ زیست کی اور میں، مت پوچھ
اس جگہ ہوں کہ تری پلکوں کا سایا بھی نہیں

انجمن کو تری چھوڑا تو زمانہ پایا
تو نے اچھا ہی کیا مجھ کو پکارا بھی نہیں

بہت حسین سہی تیرے التفات کی بات
مگر یہ بات، یہ ترکِ تعلقات کی بات

تری نگہ نے فسانے سنائے تھے کیا کیا
کہاں سے ذہن میں آئی غمِ حیات کی بات

وہاں تو کچھ بھی نہ تھا دل کی دھڑکنوں کے سوا
جو کوئی پوچھے تو میں کیا کہوں گا رات کی بات

گھنیری پلکوں کا جانے کہاں سے ذکر آیا
ستم زدوں نے تو چھیڑی تھی کائنات کی بات

بری سہی وہ مگر قابلِ معافی تھی
زباں پہ آئی جو دل کے معاملات کی بات

آخر کوئی بات تو ہو نا
مجھ سے نفرت ہی کرو نا

ایک نظر بھرپور اٹھا دو
ہم پہ یہ احسان دھرو نا

نظریں موڑو دل تو نہ توڑو
اتنے تو بے حس نہ بنو بنا

شعروں میں ڈھل کر نکلی ہے
دل کی دھڑکن تم بھی سنو نا

ایک سے دو ہو جائیں تو بہتر
آؤ تم بھی ساتھ چلو نا

میری حیات اک سادہ ورق ہے
رنگِ زلف و لب بھرو نا

ہم تم سے ملنے آئے ہیں
کچھ تو بولو، کچھ تو کہو نا

ٹوٹے دل کی آس نہ توڑو
بات اتنی سی مان بھی لو نا

تیرؔ ان کو بھول بھی جاؤ
دل پہ یہ بھی جبر سہو نا

◆◆

حضور کی نگہ لطف کا ہے یہ بھی کرم
کہ آشنائے غمِ روزگار ہو گئے ہم

کچھ اپنا زعمِ وفا تھا جو ہم رہے خاموش
کچھ ان کی سحر نگاہی کا رکھ لیا تھا بھرم

بڑھے ہیں بارِ غمِ زیست لے کے شانوں پر
وہ جن سے اٹھ نہ سکا تھا تمھاری چاہ کا غم

جفا طرازیِ دشمن کا کیا گلہ وہ کرے
جسے نوازشِ احباب بن گئی ہو ستم

نہ پوچھ ہم سے کہ توڑے ہیں کس طرح ہم نے
ترے خیال کے ترشے ہوئے حسین صنم

تمھاری پلکوں کے سائے بھی ہو گئے مفقود
رہِ حیات میں اب اس جگہ ہے اپنا قدم

ترے نثار غمِ روزگار توڑ بھی دے
طلسمِ ناز و فسونِ عنایتِ پیہم

بڑھے چلیں نہ رُکیں ہم سفر اب اور کہیں
ہم آ رہے ہیں ذرا اور ہو لیں تازہ دم

وہ پوچھتے ہیں تو تیر ادب سے یہ کہہ دو
حضور کی ہے عنایت، حضور کا ہے کرم

◆◆

یوں بھی ہیں زندگی کے طور، یہ بھی ہے زندگی کی بات
تم بھی نہ کام آ سکے کچھ ہوئے ایسے حادثات

ہائے یہ خود فریبیاں، ذہن کی پردہ پوشیاں
دیکھ رہا ہوں خواب میں عیش کے دن خوشی کی رات

کارگہِ حیات نے فرصتِ فکر ہی نہ دی
یاد تو اکثر آئی ہے آپ کی چشمِ التفات

آپ ستم سرشت ہیں، آپ جفا پرست ہیں
یہ بھی نہ کھل کے کہہ سکے ہائے یہ ان کہی سی بات

آج کی رات کل کا دن، آج کی موت کل کی زیست
مقصدِ ہر فنائے ذات، خلقتِ یک دگر حیات

◆◆

ہجومِ رنج و غم میں گاہے گاہے مسکرا لیں گے
گھنی تاریکیوں میں یوں بھی ہم شمعیں جلا لیں گے

عنایت تیغِ ابرو کی، لطافت تیرِ مژگاں کی
تمھارے چاہنے والے بھلا اب اور کیا لیں گے

نہ کھینچو ہاتھ اب مشقِ ستم سے یہ بھی اچھا ہے
کہ ہم اپنا شکیب و ضبطِ غم تو آزما لیں گے

یہ شب گزری تو کل کیا ہو گا یہ بھی تو ذرا سوچو
چلو ہم وعدۂ فردا کا دھوکا آج کھا لیں گے

رہی بھی ان سے رسم و راہ اب باقی تو کیا حاصل
وہ اپنی راہ جائیں گے، ہم اپنا راستہ لیں گے

بوتلیں خالی ٹوٹے پیمانے
یوں بھی دیکھے ہیں ہم نے مے خانے

کاش تم مسکرا دیے ہوتے
دل شکستہ بہت تھے دیوانے

دیکھو کس سمت وہ نگاہ اٹھے
شرط بد لی ہے مجھ سے دنیا نے

شمع کیا یوں ہی جلتی جائے گی؟
خاک ہوتے رہیں گے پروانے؟

آپ کی چشم نم کہے تو کہے
میری بربادیوں کے افسانے

پھر سے لَو دے اٹھا چراغِ حیات
آس پھر سے بندھائی فردا نے

اب نہ وہ ہم رہے نہ وہ گلیاں
لا کے مارا کہاں پہ دنیا نے

◆◆

حکایت ہائے گل پیراہن و غنچہ دہن کہہ دوں
کہو تو جو فسانے ہیں چمن اندر چمن کہہ دوں

مجھے اندیشہ ہے روئے سخن کی روسیاہی کا
نہیں تو آپ کے دل میں جو ہے سب من وعن کہہ دوں

یہی اچھا ہے ان کو استعاروں ہی میں رہنے دے
یہ باتیں تلخ ہوں گی میں جو اے شیریں سخن کہہ دوں

بگڑنے کا بھی عالم اپنے دیکھو آئینہ لے لو
نئے ڈھب سے سنو گے، قصۂ دار و رسن کہہ دوں؟

وہ بات اپنی تباہی کی، وہ قصہ اپنے مٹنے کا
وہ جس سے آپ کے ماتھے پہ آئے گی شکن کہہ دوں؟

جو چپکے سے کہی جائیں تو انعامِ اسیری لیں
وہ باتیں، اگر میں برسرِ ہر انجمن کہہ دوں

حیات مانگی تھی، نذر تم لہو کرتے
خود اپنے خون سے تزئینِ رنگ و بو کرتے

شکستہ رنگ ہیں محفل میں تیرے دیوانے
بڑے جری تھے ترا ذکر گو بہ گو کرتے

جنوں میں لغزشِ مستانہ خوب ہے لیکن
کسی کا چاک گریباں کبھی رفو کرتے

شکستگی کا یہ احساس کھائے لیتا ہے
وگرنہ ہم تو ابھی اور جستجو کرتے

یہی کہ تُو ہے مری روح، میری شمعِ حیات
ہم ان سے اور بھلا کیسی گفتگو کرتے

مری تباہی کا ذکر اور یہ جبیں کی شکن
یہ بات ہم جو اگر تیرے روبرو کرتے؟

فرقتِ دم بہ دم کی بات کرو
خونِ دل ضبطِ غم کی بات کرو

غمِ دنیا سے ہار آیا ہوں
ان کی چشمِ کرم کی بات کرو

ایسی راتیں کہاں پھر آتی ہیں
کاکلِ خم بہ خم کی بات کرو

آؤ ان کو کہیں گے ماہ جبیں
آؤ ان کے بھرم کی بات کرو

ذکرِ صبحِ طرب نہ ہو جب تک
ظلمتِ شامِ غم کی بات کرو

پا ہی جاؤ گے اس گلی کا سراغ
اس کے نقشِ قدم کی بات کرو

جام آتا ہے اپنے ہاتھ میں کب
بیٹھو اور جامِ جم کی بات کرو

◆◆

مجھے بھی زیست کی حس دو، مجھے بھی راہ پہ لاؤ
میں گر گیا ہوں مجھے بھی یہیں کہیں سے اٹھاؤ

اٹھو کہ آج نئے رنگ دیں زمانے کو
میں دل کا خون دوں اور تم نظر سے مے چھلکاؤ

گھٹن اندھیروں کی باقی ہے بزمِ انساں میں
جلاؤ خونِ جگر کے چراغ اور جلاؤ

تمھارے وعدے تو زندہ حقیقتیں ہیں ابھی
نہ دو فریب، چلو اب نہ اور بات بناؤ

غمِ حیات کی یہ چلچلاتی دھوپ کہ بس!
گھنیری پلکوں کے سائے کہیں کہیں پھیلاؤ

میں یورشِ غمِ دوراں سے ڈر کے بھاگا ہوں
بس ایک لمحہ مجھے اپنے بازوؤں میں چھپاؤ

وہ دل تو رکھتے ہیں پاسِ زباں نہیں رکھتے
کہے کو ان کے نہ پرکھو، نہ ان کی بات پہ جاؤ

◆◆

وہی شکستِ تمنا وہی فروغِ ہراس
یہ اپنے پاس ہے لے دے کے زندگی کی اساس

یہ فیضِ کش مکشِ زیست پہ مقامِ حیات
کہ آج تم بھی نظر آتے ہو اُداس اُداس

کرم حضور کا عہدِ وفا جو توڑ دیا
نوازشِ غمِ دوراں مٹا جو ہر احساس

ملے نہ پھول تو کانٹوں سے نبھ گئی ہوتی
خزاں رسیدہ بہاریں بھی ہم کو آئیں نہ راس

جنوں کی شعلہ خرامی کو دیکھ کر شاید
خرد بھی آج بدلنے لگی ہے اپنا لباس

زیست پہلے ہی سے بے رنگ و لطافت بھی نہ تھی
ہاں مگر، تم سے الگ حاملِ عشرت بھی نہ تھی

تم نے اچھا کیا آئینِ وفا توڑ دیا
ہم کو یہ رسم بجا لانے کی فرصت بھی نہ تھی

آہ! وہ دل کہ حریفِ غمِ دوراں نہ ہوا
اُف! یہ دنیا کہ شریکِ غمِ اُلفت بھی نہ تھی

تم نے پھر کس لیے تکلیفِ عنایت کی ہے
تم سے تو ترکِ محبت کی شکایت بھی نہ تھی

کاٹ دی شورشِ دوراں کے سہارے یہ حیات
تم نہ ساتھ آئے تو کچھ ایسی ضرورت بھی نہ تھی

ہر تمنا اس طرف صرفِ نظر ہوتی گئی
وہ نگہ بے باک سے بے باک تر ہوتی گئی

اک خلش، اک آرزو تھی جس کی رو میں زندگی
دم بہ دم بڑھتی گئی، گو مختصر ہوتی گئی

تم بھی تھے، دنیا بھی تھی، دل بھی تھا، خونِ دل بھی تھا
اس کشاکش میں خود اپنی بھی بسر ہوتی گئی

زخم تھا رِستا رہا، بہتا رہا، بڑھتا رہا
زندگی آغشتۂ خونِ جگر ہوتی گئی

اوّل اوّل دل کو خود پر بھی یقیں آیا نہ تھا
رفتہ رفتہ وہ نظر بھی معتبر ہوتی گئی

وہ ماہ وش ہے زمیں پر نظر جھکائے ہوئے
ستارے بیٹھے رہیں محفلیں سجائے ہوئے

گئے تھے کتنی اُمنگوں کو لے کے سینے میں
جو تیری بزم سے اٹھے تو سَر جھکائے ہوئے

ہمیں بھی پیار سے دیکھو کہ ہم ہیں خستہ جگر
غمِ زمانہ کے مارے ہوئے، ستائے ہوئے

ہمیں تو ایک نہیں کشتۂ مآلِ کرم
کچھ اور بھی ہیں فریب نگاہ کھائے ہوئے

خیالِ دوریِ منزل تھکا بھی دیتا ہے
چلے چلو ابھی آگے قدم بڑھائے ہوئے

کبھی جو رہتے تھے سرمست نشرِ غمِ دوست
وہ جا رہے ہیں غمِ جاں سے منہ کی کھائے ہوئے

اب چاہے تو مان نہ مان
ہم تو ہیں تیرے مہمان

شام سے دل اُمنڈا اُمنڈا
رات گئے چڑھتا طوفان

ہمدم ان کی بات نہ چھیڑ
کیسے وعدے کیا پیمان

تم جو نہیں ہو ساتھ تو اب
راہیں ہیں کتنی سنسان

رستے پہ لگنا مشکل
منزل کا ملنا آسان

اچھا آپ کی بات رہی
اچھا ہم خود تھے نادان

درد کے مارے آئے ہیں
دیکھ ذرا ان کو پہچان

ترکِ محبت کچھ بھی سہی
ان کا ہے یہ بھی احسان

دل کا مول چکاتے ہیں
ایسے بھی ہیں کچھ انسان

◆◆

کیسی شام تھی کیسی سحر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو
چوٹ کہاں تھی درد کدھر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو

کیا تھے وعدے، کیا تھیں قسمیں، کیسے کیسے پیاں تھے
آج فقط انکار ادھر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو

کل کی آس پہ جی لیتا ہوں، جینے کا کیا حال کہوں
اک انجانی بات کا ڈر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو

کوئی کسی کے درد کو سمجھے، کب فرصت آئینے سے
کس کے حال کی کس کو خبر ہے، چھوڑو بھی ان باتوں کو

وہ ہیں اوجِ فلک کے محافظ، میں پستی کا رکھوالا
اپنا اپنا ذوقِ نظر ہے، چھوڑو بھی ان باتوں کو

افسردہ ہوں ان کے دشمن کیسی باتیں کرتے ہو
میرے دُکھ کا ان پہ اثر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو

تم نے کون سے دُکھ جھیلے ہیں کون سے ایسے ناز اٹھائے
پھر کیوں سب الزام اُن پر ہے چھوڑو بھی ان باتوں کو

◆◆

جو آج نہ ہو سکے سو کل ہیں
اب وقت کے فیصلے اٹل ہیں

وہ ہاتھ اٹھا رہے ہیں تیغیں
سمجھے تھے جنھیں حضور شل ہیں

یہ شب کی سیاہیاں بھی ہم دم
کٹتی ہیں ابھی کہ چار پل ہیں

افسوس وہ فیصلے غلط تھے
اور آپ یہ سمجھے برمحل ہیں

کیا اور بھی رہ گئے ہیں کچھ تیر
کیوں آپ کی تیوریوں پہ بل ہیں

یہ سلسلے کارِ زندگی کے
پیچ و خمِ زلف کے بدل ہیں

اب کون کہے کہ میرے یہ شعر
گو تلخ ہیں حاملِ غزل ہیں

◆◆

اپنے جینے کو کیا پوچھو صبح بھی گویا رات رہی
تم بھی روٹھے جگ بھی روٹھا یہ بھی وقت کی بات رہی

پیار کے کھیل میں دل کے مالک! ہم تو سب کچھ کھو بیٹھے
اکثر تم سے شرط لگی ہے اکثر اپنی مات رہی

لاکھ دیے دنیا نے چرکے، لاکھ لگے دل پہ پہرے
حسن نے لاکھوں چالیں بدلیں لیکن عشق کی گھات رہی

تم کیا سمجھے تم سے چھٹ کر ہاتھ بھلا ہم کیوں ملتے
چشم و دل کے شغل کو اکثر اشکوں کی برسات رہی

تم سے دو دو بات کی خاطر ہم آگے بڑھ آئے تھے
پیچھے پیچھے ساتھ ہمارے تلخی لمحات رہی

ٹھنڈی ٹھنڈی آہ کی خوشبو زم و گرم اشکوں کے ہار
سچ پوچھو تو اپنی ساری زیست کی یہ سوغات رہی

کیسے صبح کو شام کروں گا، کیسے کٹیں گے عمر کے دن
سوچ رہا ہوں اب جو یہی بے چارگیِ حالات رہی

◆◆

حالِ دل کچھ جو سرِ بزم کہا ہے میں نے
وہ یہ سمجھے ہیں کہ الزام دیا ہے میں نے

منہ تو پھیرا ہے کبھی یہ بھی تو سوچا ہوتا
تمھیں چاہا ہے، تمھیں پیار کیا ہے میں نے

لا سکو گے سرِ پیشانی وہ تابانی و نور
تمھیں اشعار میں جو بخش دیا ہے میں نے

کیا کہیں سیکھ لیے ہیں نئے اندازِ فریب؟
باندھتے ہو نئے پیماں یہ سنا ہے میں نے

تم نے دنیا کی طرح آنکھ پھرائی ہے تو کیا
یہ بھی اک جبر اسی دل پہ سہا ہے میں نے

ضبط کی داد نہ دی کوئی زمانے نے مجھے
خون کا گھونٹ بہرحال پیا ہے میں نے

یہ غمِ تلخیِ دوراں، یہ محبت کا جنوں
خوب یہ درد بھی اک مول لیا ہے میں نے

◆◆

گر تیری نگاہوں کا اشارا بھی نہ ہوتا
یہ درد کبھی دل کو گوارا بھی نہ ہوتا

گر دل کو غمِ زیست کا یارا بھی نہ ہوتا
شاید غمِ جاناں نے پکارا بھی نہ ہوتا

ہوتی نہ جو مہتاب نگاہی کی عنایت
پلکوں پہ مری ایک ستارا بھی نہ ہوتا

یا شورشِ دوراں سے سکوں لمحے کو ملتا
یا بحرِ غمِ جاں کا کنارا بھی نہ ہوتا

پُر پیچ نہ ہوتی جو رہِ منزلِ ہستی
شاید تری زلفوں کا سہارا بھی نہ ہوتا

تسکیں کو جو ہوتی تری نظروں کی گھلاوٹ
میں تلخیٔ ایام سے ہارا بھی نہ ہوتا

جو کچھ بھی رہے ہم ہی رہے درد کے مارے
مٹ جاتے جو ہم کوئی تمھارا بھی نہ ہوتا

چھن جاتا جو اس یاد میں جینے کا سہارا
یہ تنگ جہاں عشق کا مارا بھی نہ ہوتا

◆◆

وہ تیری عنایت کی سزا یاد ہے اب تک
آیا تھا خدا یاد، خدا یاد ہے اب تک

چھلکی ہوئی آنکھوں میں مئے سرخ کے ڈورے
زلفوں کی وہ لہرائی گھٹا یاد ہے اب تک

وہ جسم کی خوشبو کی پراسرار لپیٹیں
وہ معجزۂ موجِ صبا یاد ہے اب تک

وہ چاندی کے پانی سے دھلے عارض و رخ پر
کیفیتِ صد رنگِ حنا یاد ہے اب تک

تھی جس کو بہ ہرگام سہارے کی ضرورت
مجھ کو وہ تری لغزشِ پا یاد ہے اب تک

وہ باتوں ہی باتوں میں بگڑ جانے کے انداز
وہ روٹھ کے منے کی ادا یاد ہے اب تک

قربت کی تمنا کو سمیٹے ہوئے دوری
وہ اپنی خودی، تیری انا یاد ہے اب تک

جو سر بہ ہمہ زعم جھکا تھا ترے آگے
جو دل کہ تھا راضی بہ رضا یاد ہے اب تک

ہلکے سے اشارے پہ وہ جاں دینے کی خواہش
وہ دورِ جنوں عہدِ وفا یاد ہے اب تک

کیا تجھ کو وفاؤں کی ادا یاد رہے گی
مجھ کو تو ترا طرزِ جفا یاد ہے اب تک

اب سختیِ دوراں کی کڑی دھوپ ہے اور ہم
لیکن ترے کوچے کی ہوا یاد ہے اب تک

◆◆

۳

اب وہ جو نہیں ان کی تمنا بھی بہت ہے
جینے کے لیے شورشِ دنیا بھی بہت ہے

اب سرد ہوا شعلۂ جاں سوزِ جنوں بھی
اب گرمیِ حسنِ رُخِ زیبا بھی بہت ہے

خوش قامتیِ سرو کا چرچا ہے غنیمت
اب تذکرۂ نرگس و لالہ بھی بہت ہے

تم کون سے تھے ایسے سزا وارِ عنایت
وہ پوچھ رہے ہیں تمھیں اتنا بھی بہت ہے

یا تلخیِ مے ہی تھی جوابِ غمِ دنیا
یا ذکرِ مے و ساغر و مینا بھی بہت ہے

یا گردشِ دوراں کو بھی خاطر میں نہ لاتے
یا اب کسی اُمید پہ جینا بھی بہت ہے

◆◆

ارزانیٔ جنسِ دل و جاں یاد کریں گے
یہ گرمیٔ بازارِ بتاں یاد کریں گے

دل بستگیٔ خاطرِ ناکام کی خاطر
خوش قامتیٔ سرو قداں یاد کریں گے

ہم سختیٔ ایّام کی ہر ضربِ گراں پر
لطفِ نگہِ لالہ رُخاں یاد کریں گے

واں کم نگہی ٹھہری تو یاں کم طلبی ہے
یہ سلسلۂ ربطِ نہاں یاد کریں گے

چپکے ہیں وفا کیش پرستاروں کے دل بھی
کڑی ہے کبھی یوں بھی کماں یاد کریں گے

ہاں درد کے ماروں پہ ابھی مشقِ ستم اور
یہ لوگ بھی کیا، جانِ جہاں یاد کریں گے

ہم نے بھی گزاری کبھی رو کر کبھی ہنس کر
کچھ روز تو تھے ہم بھی جواں یاد کریں گے

◆◆

سکوں ملے بھی تو وہ زہر میں ہے رس میں نہیں
مرا علاج مسیحا نفس کے بس میں نہیں

وہی گھٹن وہی احساسِ تیرگیِ حیات
چمن میں کون سی نعمت ہے جو قفس میں نہیں

سکونِ زیست سرِ دارِ عشق ملتا ہے
سکونِ زیست نہاں خانۂ ہوس میں نہیں

لگی وہ آگ جلے برق و آشیاں دونوں
گماں غلط، کہ تپش میرے خار و خس میں نہیں

ہزار جامِ مئے تلخ پی چکے لیکن
وہ ایک جام کہ جو میری دسترس میں نہیں

جو تم بھی آؤ تو ہم ساتھ مسکرائیں گے
سیاہ راتوں میں یوں بھی دیے جلائیں گے

یہ بزمِ زیست بہ عنوانِ نو سجائیں گے
نئی زمین، نئے آسماں بنائیں گے

کبھی ہنسیں گی بہاریں کبھی کھلیں گے جو پھول
تو ہم ترے رُخِ رنگیں سے لَو لگائیں گے

رہی جو دل میں تو غم کے پہاڑ ٹوٹیں گے
زباں کھلے گی تو سو زخم مسکرائیں گے

غمِ حیات کی ان سخت کوشیوں کے حضور
ہمیں یہ ڈر ہے کہ ہم تم کو بھول جائیں گے

ہوا میں زلف کی خوشبو، نہ گل میں عکسِ جمال
یہاں تو کھل کے ترا نام لے نہ پائیں گے

لکھیں گے خونِ جگر سے حدیثِ عارض و لب
ہم اپنا زورِ قلم یوں بھی آزمائیں گے

◆◆

وہ کشش غم کی مداوائے الم سے پہلے
واہ کیا ہُوک اٹھی گریۂ غم سے پہلے

کس نے کی اس نئے انداز سے تشریحِ وفا
کون سمجھا رسن و دار کو ہم سے پہلے

بوئے گل، موجِ صبا دے گئی منزل کا پتا
تھے نشاں یہ بھی ترے نقشِ قدم سے پہلے

اب جو رسوا سرِ بازار نظر آتے ہیں
وہ بھی کچھ تھے نگہِ لطف و کرم سے پہلے

شاہد جوششِ طوفاں ہے سکوتِ ساحل
ڈوبتے دیکھا ہے دل دیدۂ نم سے پہلے

کیسا مارا ہے رہِ عشق میں دنیا نے ہمیں
پیچ منزل کے بھی تھے زلف کے خم سے پہلے

ہم سے دیکھی نہیں جاتی یہ پشیماں نگہی
کاش دل دیکھتے تم مشقِ ستم سے پہلے

◆◆

ان سے وہ رسمِ ملاقات چلی جاتی ہے
یہ بھی سو بات میں اک بات چلی جاتی ہے

وہی بے مہریِ دنیا کی شکایت ہے جو تھی
وہی بے کیفیِ حالات چلی جاتی ہے

دل سے کس طرح ہٹے سایۂ وحشت کہ ابھی
ان نگاہوں کی کرامات چلی جاتی ہے

میری آشفتہ مزاجی پہ وہ ہنس دیتے ہیں
یوں بھی اک طرزِ مدارات چلی جاتی ہے

جب سے اس بزم کا دستور بنی مہر لبی
رسمِ ابہام و اشارات چلی جاتی ہے

نام مرنے پہ بھی ہے ان کے وفاداروں میں
کام رُک جائے مگر بات چلی جاتی ہے

ہوتا آیا ہے غمِ زیست عبارت ان سے
گرمیِ بزمِ خیالات چلی جاتی ہے

آہ بھر لیجیے رو لیجیے کہہ لیجیے شعر
وہ گراں باریِ جذبات چلی جاتی ہے

ہم کہاں، بزمِ گہِ ناز کہاں، پھر یہ غزل
عرضِ احوال و شکایات چلی جاتی ہے

◆◆

نکھرا خزاں سے رنگِ بہاراں ہے ان دنوں
ویرانیوں سے بڑھ کے گلستاں ہے ان دنوں

کم مایہ مور مائلِ پرواز کیوں ہوئے
برہم بہت مزاجِ سلیماں ہے ان دنوں

پھر تیز ہو چلی ہے ہوائے فریبِ عشق
کتنا حسین عہد ہے پیماں ہے ان دنوں

شیخ آگیا بلندیٔ منبر سے فرش پر
پھر سازشِ بلند کا امکاں ہے ان دنوں

کھینچی عجیب کرب سے ساحل نے آہِ سرد
گویا سکوت برلبِ طوفاں ہے ان دنوں

پھر بڑھ کے ہم نے جامِ تمنّا اُٹھا لیا
پھر اک نئی شکست کا ارماں ہے ان دنوں

وہ دورِ حادثاتِ جہاں ہے کہ الاماں
اپنا تو بس خدا ہی نگہباں ہے ان دنوں

◆◆

ہم اس زمیں پہ کریں تجھ کو پیار کیا کہ جہاں
خدا کی سانس کی آواز بھی ہوئی معدوم
کلی کے خوں سے بھی آیا نہ کچھ چمن پہ نکھار
متاعِ حسنِ گلستاں ہے موجِ بادِ سموم
گلوں میں بلبلِ شیریں نوا کا ذکر ہو کیا
کہ آج انجمنِ گلستاں میں صدر ہے بوم
شکایتِ ستمِ بے حساب کیا کرتے
لطافتِ کرمِ لاجواب ہے معلوم

◆◆

زخم کھلے پڑتے ہیں دل کے موسم ہے یہ بہاروں کا
لالہ و گل کی بات نکالو، ذکر کرو انگاروں کا

ہم دکھیارے ان کے سہارے چار قدم ہی چل لیں گے
چاند کا آخر ہم کیا لیں گے، کیا بگڑے گا تاروں کا

ایک تبسّم، ایک نگہ خاموش تکلّم، وہ بھی نہیں
کیا ہو گا جینے کا سہارا ہم سے دل افگاروں کا

ہم تو ٹھہرے غم کے مارے جینے کو جی ہی لیں گے
کیا ہو گا در چشم سبو، بردوش چمن برداروں کا

دل ہے لذّت غم کا خوگر سنتے ہی چونک اٹھتا ہے
ذکر کوئی جب چھڑ جاتا ہے ان نازک تلواروں کا

جشنِ طرب کے عنواں کتنے پھیلے کتنے عام ہوئے
تم ہی کہو کچھ اپنی بیتی، قصہ درد کے ماروں کا

طولانی ہے غم کی کہانی پھر وہ کہاں موضوعِ غزل
بات بنات النعش کی چھیڑو ذکر کرو مہ پاروں کا

◆◆

محروم تلخیِ مے خود آگہی شویم
ایں طور ہم رہینِ غمِ زندگی شویم
آمد بہ کارِ تمکنت و عجزِ عشقِ ما
واقف ز رسمِ دار و رہِ بندگی شویم
اے وائے بر سرشتِ خلوص و وفائے ما
اکثر نشانۂ تبرِ دوستی شویم
ما زیستیم مثلِ چراغے کہ کشتہ شد
شادیم بہرِ تیرہ دِلاں روشنی شویم

◆◆

اب وہ دیس کہاں ہیں جن میں گلیاں جھانکیں دوار ملے
کیسے کیسے روپ نکھارے کیسے کیسے پیار ملے

زخم پہ پھایا رکھنے والو زخم کی لذت کیا جانو
وہ سمجھیں گے جن کو اکثر پھول سے بہتر خار ملے

وہ تو کہو بپتا ایسی تھی تم سے بھی جو ٹل نہ سکی
ملنے کو دکھ درد کے مارے تم سے کتنی بار ملے

پاؤں کے چھالے جب اکسائیں ہم کیسے بیٹھے رہ جائیں
راہ کٹھن ہے دیکھو کیا ہو دشت ملے کہسار ملے

جنگل جنگل صحرا صحرا دیوانے کی کھوج رہی
سنتے ہیں کچھ پاؤں کے کانٹے کچھ دامن کے تار ملے

تیری زلف سے منزل تک ہے ایک ہی رستہ طے ہو گا
چاہے حکمِ رسن بندی ہو، چاہے اِذنِ دار ملے

◆◆

ربّ کی پہچان ہو گئی آخر
آس کا ٹوٹنا ہی کام آیا
دل میں برسی ہے روشنی کی پھوار
میرے ہونٹوں پہ کس کا نام آیا
دل کہ سالارِ لشکرِ جاں تھا
عشق کے معرکے میں کام آیا
ہوئی تقسیم جب زمینوں کی
دشت ہی دشت میرے نام آیا

◆◆

ابھی بہت میرے نام کی ہے ابھی تو یک دو پیالہ بھی ہے
ابھی سے اٹھ جاؤں میکدے سے ابھی تو احساسِ تشنگی ہے

ابھی سے کیوں ہے یہ فکرِ درماں ابھی سے کیوں چارہ گر کا احساں
ابھی تو کچھ درد میں کمی ہے ابھی تو احساسِ زندگی ہے

بہت ہی نازک تھا دل کا شیشہ جوان کی بے مہریوں سے ٹوٹا
انھیں بھی اے کاش یہ خبر ہو کہ چوٹ کتنی کڑی پڑی ہے

دل اک کھلونا ہے آرزو کا نہ اس کو چھلیں نہ اس کو توڑیں
حضور میں ایک اجنبی ہوں حضور یہ میری زندگی ہے

نوازشِ جنبشِ نظر لے شکستِ احساس کی خبر لے
کہیں وہ دل بھی نہ ٹوٹ جائیں کہ جن کے دم سے ہما ہمی ہے

کہاں ہیں وہ صبح کے اُجالے، تھے جن کے تم گیت گانے والے
ابھی تو کچھ طور ہیں نرالے ابھی تو کچھ اور تیرگی ہے

ابھی سے کیسی مچی ہے کھلبل ابھی تو کچھ اور ہو گی ہلچل
زمین کروٹ بدل رہی ہے ابھی فضاؤں میں بے کلی ہے

وہ خود کو کہتے رہے ہیں احقر عجیب شے ہیں جنابِ باقرؔ
یہ ان کا دراصل عجز ہو گا یہ ان کی دراصل سادگی ہے

◆◆

رند ہر ایک تہی جام خدا خیر کرے
یہ ہے مے خانے کا انجام خدا خیر کرے

الحذر تیزیِ رفتارِ جہانِ گزراں
الاماں شورشِ ایام خدا خیر کرے

دیکھیے وقت کی رفتار کی زد پر کون آئے
یہ بدلتے سحر و شام خدا خیر کرے

کس کی آمد پہ کھلے ہیں یہ دریچے دل کے
کون آیا ہے سبک گام خدا خیر کرے

پھر بڑھی لذتِ آزاری و ایذا طلبی
پھر سے مچلا دلِ ناکام خدا خیر کرے

باقر و قیس کے دم سے تھی رہِ رسمِ وفا
ہوئے یہ لوگ بھی بدنام خدا خیر کرے

زخم بھی جب کھاتے ہیں دل پر کہتے ہیں کہ نرالے ہیں
دیکھو تو ان دل والوں کو کتنے بھولے بھالے ہیں

اس کی قربت میں جو بیتے جو رنگیں اس یاد سے ہیں
وہ لمحے، وہ سپنے ہم نے کتنے پیار سے پالے ہیں

چڑھتی دھوپ اور ڈھلتی چھاؤں کے راز بتائیں گے ہم لوگ
شام سویرے اس کی گلی کے آنے جانے والے ہیں

دل کے باغ کی سیر کو آؤ دیکھو کیسی زینت ہے
اوپر اوپر زخم کھلے ہیں بھیتر بھیتر چھالے ہیں

یہ نظمیں یہ غزلیں کیا ہیں ان کے بھیتر جھانک کے دیکھ
کتنے داغ چھپائے ہم نے کتنے رنگ اُجالے ہیں

تم نے کون سے دنیا اوپر غم جھیلے ہیں دنیا کے
باقرؔ صاحب خیر مناؤ، کیوں جینے کے لالے ہیں

◆◆

تیرے شیدا بھی ہوئے عشق تماشا بھی ہوئے
تیرے دیوانے ترے شہر میں رسوا بھی ہوئے

زُلف تو زُلف ہے دنیا سے بھی اُلجھے ہیں کہ ہم
اک بگولا بھی بنے حاملِ صحرا بھی ہوئے

تم تو سن پائے نہ آوازِ شکستِ دل بھی
کچھ ہمیں تھے کہ حریفِ غمِ دنیا بھی ہوئے

ہم فقیرانِ محبت کے عجب تیور ہیں
رزمِ کعبہ بھی بنے، بزمِ کلیسا بھی ہوئے

مٹ کے ہم خاک ہوئے خاکِ رہِ کوئے بتاں
بن کے ہم حاصلِ صد بزمِ تجلی بھی ہوئے

پیشِ خورشید رُخاں ذرۂ ناچیز رہے
اور ہم روکشِ حسنِ رُخِ زیبا بھی ہوئے

زینتِ محفلِ صد زہرا جبیناں ہوئے ہم
ہاں مگر یہ کہ بھری بزم میں تنہا بھی ہوئے

یوں تو باقرؔ بھی رہے خاک نشینوں میں ترے
یہ الگ بات ترے لطف سے یکتا بھی ہوئے

◆◆

دل میں مچلی تو کبھی تیر گئی آنکھوں میں
بگڑی بگڑی سی وہ تصویر رہی آنکھوں میں

ہائے وہ نشہ کہ اترا تو اثر تھا کچھ اور
یاد دل سے جو اٹھی خون بنی آنکھوں میں

جھانک کر تم بھی تو اے زہرہ جبینو دیکھو
ایک ہم شکل تمھاری ہی بسی آنکھوں میں

دل میں پھر شوق نے اک ہلکی سی چٹکی لی ہے
ایک صورت تھی جو پھر گھوم گئی آنکھوں میں

اپنا اصنام خیالی سے تعلق نہ گیا
آج پھر بزم نئے ڈھب سے سجی آنکھوں میں

اے خوشا وقت کہ بیدار تھا جب جذبۂ شوق
ہم نے دیکھی تھی شرارت کی ہنسی آنکھوں میں

عمر بھر دل میں رہی تشنۂ تکمیل طلب
ایک بے چارگیِ شوق رہی آنکھوں میں

باقرؔ آئے تو بہت دور مگر شکل تری
کبھی تو دل میں رہی اور کبھی آنکھوں میں

◆◆

مہرِ اُمید و ماہِ تمنا کہیں گے ہم
تم سامنے جو آئے تو کیا کیا کہیں گے ہم

کس منہ سے اپنے آپ کو یوسف بتائیں گے
یہ تو ہوا کہ تم کو زلیخا کہیں گے ہم

دنیا کے ساتھ تیرے چلن بھی بدل گئے
اب تیرے غم کو بھی غمِ دنیا کہیں گے ہم

ہاں مرتبہ بلند ہوا دار پر سہی
اس کو بھی اس نگاہ کا صدقہ کہیں گے ہم

حجت تمام کر کے رہیں گے ترے حضور
جو بات کہہ چکے ہیں دوبارہ کہیں گے ہم

اپنا تو اک خیال ہے وہ سرو ہو کہ دار
کہنے پہ آئے تو قدِ بالا کہیں گے ہم

تم سے الگ نہ موت ہی اپنی نہ زندگی
رسوا ہوئے تو تم کو بھی رسوا کہیں گے ہم

اے دلنواز باقرؔ خستہ کی لے خبر
وہ بچ گیا تو تجھ کو مسیحا کہیں گے ہم

◆◆

مری نگہ نے تو شرحِ غمِ نہانی کی
حجابِ دوست نے کچھ اور ترجمانی کی

گلاب بھی ہے یہاں، سرو بھی ہے، نرگس بھی
کھنچی ہے سبزہ پہ تصویر کس جوانی کی

یہ دل کی چوک تھی یا تھا نگاہ کا دھوکا
یہیں کہیں سے ہوئی ابتدا کہانی کی

کہ ہو یقین تو آنسو، نہ ہو یقین تو خون
جو اس نے بات بھی کی آنکھ کی زبانی کی

ہوں ایک عمر سے آشفتہ حال چپ چپ ہوں
کسی نے حال بھی پوچھا تو مہربانی کی

وہ برگِ خشک ہوں جس میں نہ کوئی روپ نہ رنگ
خزاں ہوں جس نے بہاروں کی پاسبانی کی

ہنسے نہ کھل کے نہ جی بھر کے روئے ہم باقرؔ
کہیں گے کس سے کہ ہم نے بھی زندگانی کی

◆◆

اس کی یاد کا جادو جاگا ہوا ہوئی بیدار
پتوں کی مضراب نے چھیڑا چندر کرن کا ستار

پڑھ لکھ کر کہلاؤ گیانی، پر یہ بھید نہ پاؤ
منہ سے تو اک لفظ نہ نکلے آنکھ سے چھلکے پیار

سر کا سودا، جان کی بازی اور عزت کا بھاؤ
دیکھو اس بازار کی رونق کیسا ہے بیوپار

بس اس کھینچا تانی میں ہے ساری کہانی ختم
کچھ ہم دل سے کھنچے کھنچے ہیں کچھ دل ہے بیزار

شعر کے امرت کی اک شرط ہے غم کے زہر کا گھونٹ
ہر لمحے کی موت نگل کر امر بنے فنکار

باقرؔ عمر گنوا کر بھی کچھ اس کا بھید نہ پائیں
جس کے گال کھلے گلاب ہیں جس کے نین کٹار

♦♦

کچھ ایسے تھک گئے تھے خم و پیچ راہ سے
تیری گلی جو آئے اسی جا کے ہو گئے
تاریکیوں کا سیل تھا امواجِ غم کا زور
محتاط ہم بھی خوب تھے چپکے سے سو گئے
سوچا تھا خود کو پائیں گے جا کر ترے حضور
تیرے حضور آئے تو خود سے بھی کھو گئے

♦♦

نغمه ز دل کشیده به دل باز داده‌ام
این ارمغان درد به دمساز داده‌ام

آن حرف بی زبان که زبان آشنا نبود
از دل بیان بلاغت آواز داده‌ام

آن زمزمه که زیر زبان چشمه شعله
پرورش هوای نغمه پرواز داده‌ام

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ہر آں مسافرے کہ رہِ شہرِ دل گرفت
من ایں ہمہ متاع پس انداز دادہ ام

در جاں ہزار نغمہ و در دل ہزار کیف
باقرؔ بہ ہر نفس، نفس ساز دادہ ام

◆◆

وہی میرے عجز و نیاز میں، وہی تیرے عشوہ و ناز میں
وہی حرفِ شوق جو چھپ گیا کبھی رمز میں کبھی راز میں

میں ہوں دل کشا تو گریز پا، کہے کون تجھ سے ترے سوا
تیرے خواب میں جو خلش سی ہے، وہ ہے میرے دیدۂ باز میں

تو ہے عرش پر، میں ہوں فرش پر مجھے ہو بھی کیسے تری خبر
تجھے میں تلاش کروں تو کیا، میں نشیب میں تو فراز میں

مجھے نیند آئے تو کس طرح مرے خواب اشک میں ڈھل گئے
مرے قلب کو تو سکوں ملے تری چشمِ فتنہ نواز میں

یہ ہے اصل فنِ دلِ سنگ چیر کے روشنی کو اتار دے
ملی آئینے کو چمک وہی جو تھی قلبِ آئینہ ساز میں

تجھے ڈھونڈتے تھے جو اہلِ دل وہ نشان تیرا بتا گئے
تو چمک ہے شبنمِ سوز میں تو لپک ہے شعلۂ ساز میں

تو نکل کے بزمِ صفات سے اسے ڈھونڈ کعبۂ ذات میں
"تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز سے"

◆◆

یاں کانٹے عذاب اور وہاں بوئے تھے کچھ خواب
رکھا نہ کہیں کا ہمیں اس در بدری نے
خود آپ سے چھن کر ہوئے آفاق میں رسوا
بدنام کیا ہم کو بہت نام وری نے
اخبار بڑھاتا رہا بیزاریٔ جاں کو
تھوڑا سا سکوں ہم کو دیا بے خبری نے
کچھ کم طلبی تھی جو زبوں حال رہے ہم
کچھ ہم کو کیا خوار تری کم نظری نے

◆◆

کچھ بھی ہیں التفات کے مارے ہوئے تو ہیں
سوچو کبھی کہ ہم بھی تمھارے ہوئے تو ہیں

تم پیار سے نگاہ اٹھا دو تو ہم بڑھیں
کہنے کو جہدِ زیست سے ہارے ہوئے تو ہیں

ناطاقتی کا طعن غلط ہم پہ اے ندیم
ہم زندگی کا بوجھ سہارے ہوئے تو ہیں

تم حکم دو بکھیر دیں ہم نغمۂ حیات
یوں تلخیِ حیات کے مارے ہوئے تو ہیں

عنوانِ زیست کیوں نہ بدل دیں بہ صلح و عشق
یوں بھی تری نظر کے اشارے ہوئے تو ہیں

◆◆

ایک لغزش سی بہ ہر گام رہی ہو گی کبھی
ہر ادا موردِ الزام رہی ہو گی کبھی

جو نظر درد کو ہر آن بڑھا دیتی ہے
قند بر تلخیِ ایام رہی ہو گی کبھی

جو نظر اب نہیں تسکینِ دلِ تشنہ لباں
وہی زینت دہِ صد جام رہی ہو گی کبھی

زُلف جو آج بکھر کے ہے شریکِ غمِ زیست
بن سنور کر وہ مرے نام رہی ہو گی کبھی

اک سنبھالا ہے جو اب درد کے ماروں کے لیے
یہی انگڑائی بھی بدنام رہی ہو گی کبھی

آج وہ شوخیِ صد ناز بھی پژمردہ سی ہے
جو سکونِ دلِ ناکام رہی ہو گی کبھی

آج جو میرے حوالے سے کہی جاتی ہے
یہ کہانی تو بہت عام رہی ہو گی کبھی

جس میں تھے سہمے ہوئے خوفِ سحر سے دو دل
ہائے وہ شام بھی کیا شام رہی ہو گی کبھی

جو نظر ناز اٹھاتی ہے غمِ دنیا کے
وہ بھی اس شوخ کو پیغام رہی ہو گی کبھی

کہہ رہا ہے یہی رہ رہ کے بلندی کا سکوت
کتنی شورش بہ لبِ بام رہی ہو گی کبھی

◆◆

کبھی جو شوخیِ رنگِ قبا کی بات چلی
چمن کی بات، نگارِ صبا کی بات چلی

وفا نوازیِ تیغِ جفا کی بات چلی
طلب کی بات چلی مدعا کی بات چلی

کبھی جو بیٹھ گئے رہروانِ منزلِ شوق
غزل نوا نگہِ سرمہ سا کی بات چلی

وہ شاخِ گل کی لچک، وہ خرامِ بادِ بہار
کہاں کہاں سے تری ہر ادا کی بات چلی

مہ و نجوم میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
ہمارے جذب تمھاری جفا کی بات چلی

الٰہی خیر مرے جذبۂ فراواں کی
کسی کے وعدۂ صبر آزما کی بات چلی

ہمارے زخم ابھر آئے بڑھ گئے ناخن
جو دستِ شوق میں رنگِ حنا کی بات چلی

◆◆

رنگِ گلستاں ماند پڑا پھر شام ہوئی پھر مہکا دل
پھر سے درد کے طوفاں بپھرے، آنکھ بھری پھر ڈوبا دل

پھر موسم نے رنگت بدلی، بادل چھائے، بہکا دل
پھر بستی میں شور مچا ہے پھر وحشت پر آیا دل

پھر وہی سحرِ زلفِ بتاں ہے پھر وہی سیرِ کوئے زیاں
ذہن نے کتنا سمجھایا تھا، ہائے وہیں پھر لایا دل

ان آنکھوں سے اپنے دل کا ربط پرانا قائم ہے
ان آنکھوں میں آنسو چھلکے اور یہاں بھر آیا دل

بزم میں بیٹھے بیٹھے گویا ذہن کے رشتے ٹوٹ گئے
کہتے کہتے سنتے سنتے جانے کیوں گھبرایا دل

دل کی بات زباں تک لا کر ہم کتنا پچھتائے ہیں
اس کی چاہ پہ کوئی پوچھے کیوں اتنا اترایا دل

کیسے کیسے لعل و جواہر کیا کیا رنگِ تمنا تھے
بھولی بھالی صورت والے رہزن نکلے لوٹا دل

شعلہ لپکا، گلشن مہکا، کون ادھر کو آ نکلا!
کس کی چال پہ چھاگل چھنکی کس آہٹ پہ مچلا دل

اس کی چاہ میں باقرؔ صاحب تم نے کیا کیا پایا ہے
چاک گریباں، آنکھیں ویراں، چھوٹا چھالا، ٹوٹا دل

◆◆

حسنِ مجسم فتنۂ عالم حشر لیے کیسا کیسا
پر او باقرؔ کیوں او کافر ہر بت کو سجدا کیسا

نقشِ قدم کی خاک ہے سر پر اپنی جبیں اور اس کا در
اس کی گلی کو، اس کی گلی سے آنا کیسا جانا کیسا

ہم تو فقیر ہیں جگ والوں سے جب بھی ملے ہیں دل سے ملے
تم بھی آؤ، تم بھی بیٹھو کھل کے ملو پردا کیسا

جانے والو اس منزل پہ ہر رستہ لے جائے گا
راہِ طلب میں شرط قدم ہے الٹا کیسا سیدھا کیسا

اپنی تمنا، اس کا تغافل کھیل سمجھ اور کھیلے جا
حسن کا مول اور عشق کا سودا مہنگا کیسا سستا کیسا

ہم مرتے دم اپنے لہو کا تم پر کیوں الزام دھریں
ہاں مگر اپنا ہاتھ تو دیکھو سرخ سا یہ جھپا گیا

کیا کوئی پھر اس راہ سے گزرا شعلہ گرفتہ سرو رواں
پھر دل میں کیوں شور مچا ہے حشر ہوا برپا گیا

پھولوں نے کچھ زخم دیے تھے کانٹوں نے تازہ رکھے
اس دنیا کی ریت عجب ہے کون برا اچھا گیا

دل کو تحفہ دینے والے یادِ گی کو جلاتے ہیں
دیکھو یہ انجانہ مسیحا روٹھ خدا گیا ہے

◆◆

باقرؔ نشانۂ غم و رنج و الم تو ہو
چھوڑو کچھ اور بات کرو درد کم تو ہو

اے کشتۂ خلوصِ محبت بکار باش
لب پر شگفتگی نہ سہی آنکھ نم تو ہو

ہر دم رہے حدیثِ معنی سے ہم کو کام
ذکرِ خدا اگر نہیں ذکرِ صنم تو ہو

کچھ تو پئے شکستِ سکوتِ شبِ الم
گریہ سہی فغاں سہی کچھ دمبدم تو ہو

چشمِ غزال و حسنِ غزل کا بیاں رہے
کچھ ایسی بات جو پئے تسکینِ غم تو ہو

قانونِ باغبانیٔ صحرا تو لکھ چکے
عنوانِ زیست بھی کسی صورت رقم تو ہو

اک عمر تو نے ٹوٹے پیالوں پہ کاٹ دی
باقرؔ پئے شراب کوئی جامِ جم تو ہو

◆◆

نیر میں ڈوبے پھر بھی پیاسے نین پیاس بجھائے کون
پیت ذرا پانی کب مانگے، من کو یہ سمجھائے کون

دل کے زخم پہ رونے والے ان آنکھوں کی دھار بھی دیکھ
چلتی تلواریں کیا جانیں، اپنے کون پرائے کون

چاہت روگ ہے روگی من کو سمجھاؤ تو کیا سمجھے
سوتا ہو تو جگا بھی لیجے، جاگے ہوئے کو جگائے کون

راہ کے سارے سنگی ساتھی اپنے گھروں کو لوٹ گئے
سَر کے بھاری بوجھ کے اوپر من کا بوجھ اٹھائے کون

بسری یادیں، بھولے چہرے، ٹکڑے ٹوٹے خوابوں کے
بیتے دنوں کے ڈھیر میں ہوں گے ڈھونڈ کے ان کو لائے کون

آنکھ میں برکھا رت اتری ہے دل میں آگ دہکتی ہے
بھڑکے اور بھی جو پانی سے، ایسی آگ بجھائے کون

شہر وفا کا اجڑا باقرؔ بیٹھے اس کے کہاں چلیں
سونے چاندی کی دنیا میں دل پر داغ اٹھائے کون

◆◆

ہر ایک رت میں نئے پیکروں میں ڈھلتے رہے
ہم اپنی آتشِ دل میں سدا پگھلتے رہے

یہ زندگی تھی کہ پیکار بینِ آتش و باد
ہوائیں چلتی رہیں اور چراغ جلتے رہے

یہ اضطراب تھا ذرّوں میں یا تھا عالمِ وجد
عناصر آپ ہی کیوں کروٹیں بدلتے رہے

کیا ہے عشق نے مربوط آگ پانی کو
دلوں کی آگ سے آنکھوں میں اشک اُبلتے رہے

بتا رہے ہیں جو دریائے دل کی گہرائی
یہ آبدیدہ گہر پانیوں میں پلتے رہے

سنا تھا دولتِ دنیا ہے میل ہاتھوں کی
اسی لیے تو سدا اپنے ہاتھ ملتے رہے

ہے روشنی کا سفر ہی شعورِ تنہائی
کہ ہم ہی سایہ بنے اپنے ساتھ چلتے رہے

اِدھر تھی دولتِ دنیا، اُدھر تھی دولتِ دل
وہ جمع کرتی رہی زر، یہ لعل اُگلتے رہے

نشاطِ وحشتِ دل بھی عجیب تھا باقرؔ
کہ منزلیں تو بلاتی تھیں ہم ہی چلتے رہے

◆◆

یہ دل تو ایک نظر میں بہل بھی سکتا ہے
مگر سرشت عجب ہے، مچل بھی سکتا ہے

تمھاری آنکھوں میں جادو ہے، میری باتوں میں
ابھی تو خیر ہے، اک روز چل بھی سکتا ہے

سہارے اور ہیں جینے کے تم نہیں نہ سہی
غمِ فراق کا مارا سنبھل بھی سکتا ہے

یہ وقت سخت سہی موت کی گھڑی تو نہیں
اٹل جو آج ہے وہ کل کو ٹل بھی سکتا ہے

وہ سرد مہری دنیا، یہ اپنی گرمی دل
اسی تضاد سے موسم بدل بھی سکتا ہے

رُکے ہیں اشک مگر احتیاط لازم ہے
کہ سیلِ راہ بدل کر نکل بھی سکتا ہے

اُگے ہیں نخلِ تمنّا میں بُور نفرت کے
حذر کرو کہ یہی پیڑ پھل بھی سکتا ہے

ہوں لاکھ تیز ہوائیں چراغ لے کے چلو
جو بجھ گیا تو کبھی اور جل بھی سکتا ہے

خیالِ حسن ہے باقرؔ کمالِ حسنِ نگاہ
وہ ایک دن کسی پیکر میں ڈھل بھی سکتا ہے

◆◆

مدرسۂ حیات میں دل کا نصاب بھی نہیں
اور کتابِ شوق میں عشق کا باب بھی نہیں

دل کے نگر کی محفلیں خواب و خیال ہو گئیں
حسنِ خیال بھی نہیں، منظرِ خواب بھی نہیں

کتنے تھے منتظر سوال وصلِ جواب کے لیے
شوقِ سوال بھی گیا، ذوقِ جواب بھی نہیں

قریۂ جاں میں چار سمت بس وہی دشتِ رائگاں
کشتیِ دل چلے کہاں موجِ سراب بھی نہیں

اے مرے دل کی جستجو! اب وہ فضائے جاں کہاں
اے مری چشمِ گریہ خو! اب وہ سحاب بھی نہیں

آبِ حیاتِ جاوداں خضر کے پاس ہے تو کیا
تشنہ لبانِ شوق کو خواہشِ آب بھی نہیں

ہوتے ہیں اضطرابِ دل کاٹتے ہیں عذابِ جاں
ذوقِ گناہ بھی نہیں، شوقِ ثواب بھی نہیں

لمحہ بہ لمحہ زندگی لحظہ بہ لحظہ موت ہے
وصل کا شوق بھی نہیں، ہجر کی تاب بھی نہیں

خیر ہوئی نوائے شوق گھٹ کے گلے میں رہ گئی
باقرِؔ بے نوا کو اب خوفِ عتاب بھی نہیں

◆◆

ہو دل لگی میں بھی دل کی لگی تو اچھا ہے
لگا ہو کام سے گر آدمی تو اچھا ہے

اندھیری شب میں غنیمت ہے اپنی تابشِ دل
حصارِ جاں میں رہے روشنی تو اچھا ہے

شجر میں زیست کے ہے شاخِ غم ثمر آور
جو ان رُتوں میں پھلے شاعری تو اچھا ہے

یہ ہم سے ڈوبتے سورج کے رنگ کہتے ہیں
زوال میں بھی ہو کچھ دل کشی تو اچھا ہے

سزا ضمیر کی چہرہ بگاڑ دیتی ہے
خود اپنی جون میں ہو آدمی تو اچھا ہے

نہیں جو لذّتِ دنیا نشاطِ غم ہی سہی
ملے جو یک دو نفس سرخوشی تو اچھا ہے

سفر میں ایک سے دو ہوں تو راہ آساں ہو
چلے جو ساتھ مرے بے کسی تو اچھا ہے

دیارِ دل میں مہکتے ہیں پھول یادوں کے
رچے بسے جو ابھی زندگی تو اچھا ہے

چلو جو کچھ نہیں باقرؔ متاعِ درد تو ہے
اسے سنبھال کے رکھو ابھی تو اچھا ہے

◆◆

جاں دے کے غمِ دل کے خریدار ہیں یہ لوگ
اے شہرِ وفا رونقِ بازار ہیں یہ لوگ

صورت پہ نہ جا دیکھ دلِ غم زدگاں کو
اس دورِ خزاں میں گل و گلزار ہیں یہ لوگ

صحراؤں میں جلتے ہیں دیے ان کے قدم سے
کوچے میں ترے سایۂ دیوار ہیں یہ لوگ

بھاتی نہیں کچھ صورتِ زیبائشِ دنیا
معنی میں مگر واقفِ اسرار ہیں یہ لوگ

ہو مرضیِ جاناں تو زمیں کیا ہے زماں کیا
خود جاں سے گزر جانے کو تیار ہیں یہ لوگ

گو عشق نے سکھلائی انھیں خانہ خرابی
خوابوں کی عمارات کے معمار ہیں یہ لوگ

خار ان سے جو الجھیں تو یہ ہیں پھول سراپا
پھولوں کی حفاظت کے لیے خار ہیں یہ لوگ

کردار میں سونا ہیں طبیعت میں غنی ہیں
اللہ کی تائید سے زردار ہیں یہ لوگ

باقرؔ تری یادیں، یہ ترے داغِ تمنا
ایسے ہی نوادر کے طلب گار ہیں یہ لوگ

◆◆

جنابِ شیخ مشیّت کے راز داں ہوتے
تو ان پہ کارِ معیشت کے گُر عیاں ہوتے

کرشمہ لغزشِ پا کا تھا باریابی میں
ادھر جو پاؤں نہ پڑتے تو ہم کہاں ہوتے

زمیں کا بوجھ اٹھایا گراں بہا ٹھہرے
وگرنہ آج بھی ہم بارِ آسماں ہوتے

یہ کن ہواؤں میں اڑتے ہیں جگنوؤں کی طرح
وہ لفظ جو سرِ قرطاسِ جاں گراں ہوتے

وہ چاہتیں بھی عجب تھیں، وہ صورتیں بھی غضب
زمانہ ساز نہ بنتے تو داستاں ہوتے

سمٹ کے رہ گئے جو سیپ میں گہر کی طرح
وہ پھیلنے پہ جو آتے تو بیکراں ہوتے

بلند ہو گئے مینار کی طرح تو کیا
مزہ تو جب تھا کہ خود جلتے سائباں ہوتے

ہمارے اشکوں نے دامن پہ لالہ کاری کی
جو آسمان پہ گرتے تو کہکشاں ہوتے

زمانہ ہم کو نہ سمجھا تو کیا گلہ باقر
یہی بہت تھا کہ ہم اپنے ہم زباں ہوتے

◆◆

اِک جہاں پیدا کرو

روشنی تاریکیوں کے درمیاں پیدا کرو
رمزِ کن کے آشناؤ! اک جہاں پیدا کرو

اپنے گُل ہائے تخیل سے سجاؤ یہ زمیں
آسماں پر تازہ نجم و کہکشاں پیدا کرو

رنگ خوابوں کے حقیقت کی فضاؤں میں بھرو
زیبِ گلہائے تمنا، گلستاں پیدا کرو

اس جہانِ تنگ میں ڈھونڈو کوئی تازہ اُفق
اس زمیں کی وسعتوں سے آسماں پیدا کرو

آسرے کچھ ہوں بھٹکتی آرزوؤں کے لیے
دل کے ویرانوں میں تازہ بستیاں پیدا کرو

آتشِ دل اور بھڑکاؤ چلی ہے بادِ سرد
ان ٹھٹھرتے حوصلوں میں گرمیاں پیدا کرو

اک سماں باندھو نظر کی وسعتوں کے واسطے
بال و پر کا امتحاں ہے آسماں پیدا کرو

سیلِ اشک اُمنڈا ہے تازہ ولولوں کے واسطے
تیز رو پانی کو روکو، بجلیاں پیدا کرو

ہر نفس گرماؤ جذبوں کی بھڑکتی آگ سے
لفظ انگارے ہوں، شعلوں کی زباں پیدا کرو

غیر کی اُنگلی پکڑ کر راستہ ڈھونڈو تو کیا
اپنی منزل، اپنی منزل کے نشاں پیدا کرو

کچھ نہیں بویا اگر اب تک تو پھر کاٹو گے کیا
کچھ تو اے صحرائے دل کے باغباں پیدا کرو

کہہ رہے ہیں تم سے یہ تاریخ کے سادہ ورق
ہوں مکاں اپنے تو پھر اپنے زماں پیدا کرو

تم کو باقرؔ دل کے تھل کی باغبانی مل گئی
اک روش بہرِ خرامِ گل رُخاں پیدا کرو

◆◆

جرم

یہ بجا کہتے ہو تم کو جھوٹ سے نفرت سی ہے
کیوں تمھارے منہ پہ ہیں دن رات سچ کے زمزمے

میں نے یہ مانا کہ باطل سے نہیں تم کو غرض
حق کو آخر کیوں لیے پھرتے ہو تم کس واسطے

ہے مجھے معلوم تم انساں ہو انساں دوست ہو
ہیں مگر محفل میں کیوں انسانیت کے تذکرے

دہر کے گرتے ہوئے اخلاق سے دل تنگ ہو
پھر بھی ہے اخلاق کی تلقین آخر کس لیے

ظلم گر حد سے سوا ہوتا ہے تم منہ موڑ لو
مضطرب ہو، جیسے ٹھیکیدار ہو انصاف کے

طنز ہے یہ طنز حاکم کا اڑاتے ہو مذاق
یہ نہیں تو تم مآلِ زندگی پر کیوں ہنسے

جرم کیا تم نے کیا ہے پوچھتے ہیں مجھ سے جرم
جرم یہ کم ہے کہ تم ہو پاسباں ادراک کے

تم ہو مجرم، زندگی کا کچھ مزا لیتے تو ہو
اور ہر نشتر کی تیزی آزما لیتے تو ہو

جھٹکوں میں درد و غم کے مسکرا لیتے تو ہو
کچھ نہیں تو زندگی کے گیت گا لیتے تو ہو

◆◆

آوازۂ حق و نعرۂ شیطان

(پریذیڈنٹ ٹرومین کے ایٹم بم استعمال کرنے کے اعلان پر)

(۱)

بلندیوں کو ندا دو کہ خود سمٹ جائیں
کہ پستیوں کے منارے ابھرتے جاتے ہیں

شعاعِ مہر مچلتی ہے جگمگانے کو
نظر فریب ستارے بکھرتے جاتے ہیں

یہ کیوں نظامِ کہن آج کانپ اٹھا
یہ سیم و زر کے خدا کیسے تلملا اٹھے
کہاں سے آکے یہ پتھر گرا ہے کیچڑ میں
جو سارے کیڑے مکوڑے بھی بلبلا اٹھے

وہ دیکھتے ہیں ادھر زعم میں حکومت کے
یہ خود فریب نظر دیکھنے کے قابل ہے
ہے ایک ذرہ کی طاقت میں کس قدر گس بل
کہ آفتاب سے بھی جنگ پر وہ مائل ہے

(۲)

ہم آج چاہیں تو ایٹم سے پھونک دیں خلقت
مگر یہ تیغوں کی جھنکار کیسی آتی ہے
یہ کون لوگ ہیں بڑھتے چلے ہی آتے ہیں
یہ کیا مذاق ہے راتوں کی نیند جاتی ہے

میرے غلام کدھر ہیں ذرا یہاں آئیں
مٹا دیں صفحۂ ہستی سے ان کمینوں کو
محل میں کوئی بھی آواز میری سنتا ہے
جلا دو، بھون دو پستی کے ان مکینوں کو

مرے خدا میں کروں کیا محل میں کوئی نہیں
محل کو خانۂ رحمت بنا دیا تو نے
تو آج خلق سے شیطاں کا کام ختم ہوا
تو کیا زمین کو جنت بنا دیا تو نے

◆◆

تاویل

تم یہ کہتے ہو بدل جائے گا قدرت کا نظام
کیا بھلا ایسا کسی دور میں ہو سکتا ہے
انگلیاں پانچ برابر کی کبھی ہوتی ہیں
کوئی قسمت کا لکھا بھی کبھی دھو سکتا ہے

اس خرافات سے کیا فائدہ سوچو تو ذرا
کون رہ جائے گا مفلس جو ہو ہر شخص امیر
تاج اور گدڑی ہمیشہ کے لیے ہیں بھائی
ہے یہ قرآن کا فرمان، رہیں شاہ و فقیر

آج بے دین بھلا بیٹھے قناعت کا سبق
آج مخلوق ہے احکامِ خدا پہ برہم
ان کو روٹی ہوئی جنت سے زیادہ پیاری
آج الحاد کا لہراتا ہے ہر سو پرچم

تم ہو بے شرم حکومت کو برا کہتے ہو
تم پہ ہے فرض اولوالامر کی تابعداری
چاہے تم مل کے ہو مزدور کہ دفتر کے کلرک
ہوئے حاکم سے جو سرکش تو بنے تم ناری

زندگی دیکھنی ہے آ کے صدر(۱) میں دیکھو
قائد آباد(۲) کے مدفن کی نہ کچھ فکر کرو
رینگتی لاشوں، سڑے جسموں کا تم نام نہ لو
نگہ مست غزل ریز کا اب ذکر کرو

ملگجے کپڑوں میں ملبوس جو آتی ہیں نظر
ان سے ہشیار وہ بدکار ہیں آوارہ ہیں
عصمتیں روٹی کے ٹکڑوں کے عوض بیچتی ہیں
بدمعاشوں کے لیے دعوت نظارہ ہیں

بے حیا ہاتھ بڑھاتے ہیں ہر اک کے آگے
کان کے پاس وہ پیسے کی صدا دیتے ہیں
کتنے جاہل ہیں ذرا سی بھی تمیز ان کو نہیں
سرج کے کوٹ پہ بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں

---

(۱) صدر بازار کراچی

(۲) قائداعظم کے مزار واقع کراچی کے گرد بسے ہوئے پناہ گزینوں کا ایک حلقہ۔

خواب میں رات عجب ماجرا میں نے دیکھا
ویسے اس خواب کی تعبیر تو الٹی ہو گی
کھانے پر مرغِ مسلّم بھی تھا شامل کل شب
شاید اس مرغ کی گرمی سے گرانی ہو گی

میں نے دیکھا کہ بہت دور سے اک ٹڈی دل
اُمنڈا آتا ہے گرجتے ہوئے بادل کی طرح
یا سمندر میں اُبلتا ہوا طوفاں جیسے
چڑھتا ہی آتا ہے امواجِ مسلسل کی طرح

خون اترا ہوا اندر کو دھنسی آنکھوں میں
اور پچکے ہوئے گالوں میں عزائم کی جھلک
جوش اتنا ہے کہ سینوں میں پھٹا پڑتا ہے
اتنے ہشیار جھپکتی نہیں آنکھوں پہ پلک

چڑھتے ہی آتے ہیں اک سیلِ رواں کے مانند
ان کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے پیہم
بڑھتے ہی آتے ہیں امواجِ قضا کے مانند
ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تیغیں ہیں علم

وہ یہ کہتے ہیں کہ تقدیر پہ ہم قادر ہیں
ان کا نعرہ ہے بدل دیں گے نظامِ عالم
وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان میں تفریق نہیں
ان کا نعرہ ہے مٹا دیں گے ہر اک جور و ستم

پار کرتے ہوئے اُمنڈے ہوئے دریاؤں کو
گھاٹیوں سے وہ پہاڑوں پہ چڑھے آتے ہیں
ایک لمحے کو بھی رُکتا ہی نہیں ان کا قدم
میں نے دیکھا وہ مری سمت بڑھے آتے ہیں

خوف سے کانپ اٹھا چیخ پڑا خواب میں مَیں
اور چونکا تو دھڑکتا رہا گھنٹوں مرا دل
میرے اس خواب کی تعبیر تو الٹی ہو گی
اپنے معبود پہ ہے مجھ کو یقینِ کامل

◆◆

فنکاروں سے

گلعذاروں کی بات کرتے تھے
ماہ پاروں کی بات کرتے تھے

زندگی سے گریز تھا تم کو
سوگواروں کی بات کرتے تھے

موجِ طوفاں سے خوف کھاتے تھے
تم کناروں کی بات کرتے تھے

آبشاروں سے تم گریزاں تھے
ریگ زاروں کی بات کرتے تھے

موت کا رقص تم کو بھاتا تھا
تم مزاروں کی بات کرتے تھے

تم بہاروں کو کیا سمجھتے تھے
جب شراروں کی بات کرتے تھے

شامِ غم کے مہیب سایوں میں
تم ستاروں کی بات کرتے تھے

برق کی زد پہ ہر نشیمن تھا
تم بہاروں کی بات کرتے تھے

....

یہ بھی کچھ وقت کا تقاضا ہے
تم جو انساں کی بات کرتے ہو

آج تم اپنے غم کو بھول چکے
غمِ دوراں کی بات کرتے ہو

ذہن پہ اُلجھنیں مسلط ہیں
زُلفِ پیچاں کی بات کرتے ہو

گاہ تم آسماں پہ چڑھتے ہو
حدِ امکاں کی بات کرتے ہو

گاہ بیچارگی سے روتے ہو
شب ہجراں کی بات کرتے ہو

ماہ و پرویں سے کھیلتے ہو کبھی
انجمستاں کی بات کرتے ہو

گاہ تم زندگی سے بیگانہ
مرگِ انساں کی بات کرتے ہو

اور کبھی اڑتے ہو خلاؤں میں
شبنمستاں کی بات کرتے ہو

دہلِ جنگ کے جواب میں تم
کفر و ایماں کی بات کرتے ہو

زہر پیتے ہو بربریت کا
لب خوباں کی بات کرتے ہو

....

آسماں سے ذرا اُتر آؤ
آؤ اس زندگی کی بات کرو

امن کے دوستی کے نغمے گاؤ
صلح کی، آشتی کی بات کرو

موت کے ہولناک اندھیروں میں
زیست کی، روشنی کی بات کرو

تہنیت دو نئی بہار کو تم
نو شگفتہ کلی کی بات کرو

نقشِ ہستی ابھارنے والو
کچھ نئی روشنی کی بات کرو

پو پھٹا چاہتی ہے دیکھو تو
ختم اب تیرگی کی بات کرو

پھر ہو تنظیمِ گلشنِ انساں
پھر تر و تازگی کی بات کرو

اور اک سادہ دل تو کہتا ہے
اُلفتِ آدمی کی بات کرو

◆◆

آزادی

آزادی کے نغمے گاؤ!
آنسو اپنے پونچھ کے آؤ
دل کی ہر اک بات چھپاؤ
منہ پہ ہنسی کے مینہ برساؤ
مست فضا میں ناچو گاؤ ...... گاؤ
آزادی کے نغمے گاؤ

غم کی کوئی بات نہ آئے
اشکوں کی برسات نہ آئے
رنج و الم کی رات نہ آئے
صبح طرب کے گیت سناؤ ...... گاؤ
آزادی کے نغمے گاؤ

دیکھو رنگِ بہاراں دیکھو
عیش و طرب کے عنواں دیکھو
نظریں مست و غزل خواں دیکھو
جام اٹھاؤ مے چھلکاؤ ...... گاؤ
آزادی کے نغمے گاؤ

محلوں میں ہے آج چراغاں
جشنِ مسرت، جشنِ بہاراں
شوخ حسیں بے باک نگاراں
کٹیاؤں میں دیپ جلاؤ ...... گاؤ
آزادی کے نغمے گاؤ

رونے کو اک عمر پڑی ہے
جینے کو بس ایک گھڑی ہے
عیش کی دیوی سر پہ کھڑی ہے
فاقہ کشو مت شور مچاؤ ...... گاؤ
آزادی کے نغمے گاؤ

◆◆

اور بازار سے لے آئے

یہ تری بزم کہ ہے روکشِ صد شرم و حیا
یہ تری بزم کہ ہے سجدہ گہِ ناز و ادا
یہ تری بزم کہ ہے قبلہ گہِ نور و ضیا
مجھ سے پہلے یہ تری بزم کا عالم تو نہ تھا

کتنی خاموش سلگتی ہوئی آہوں کی مہک
کتنے شاداب لہکتے ہوئے زخموں کی کسک
کتنے پرنور دمکتے ہوئے داغوں کی چمک
یہ تو کیا دل بھی بصد عجز تجھے نذر دیا

کتنے تخیل کے پھیلائے اُجالے میں نے
کتنے مہتاب تری بزم میں ڈھالے میں نے
کتنے تارے انھیں ہاتھوں پہ اچھالے میں نے
کہکشاں کو تری ہر آن پہ قربان کیا

تیرے عارض کو حسیں صبح کی فرحت بخشی
تری پیشانی کو تاروں کی صباحت بخشی
کھلتی کلیوں کو ترے لب کی رقابت بخشی
رہگزر کو تری گل ریز گہر بیز کیا

دہر کو ابروئے خمدار کے معنی سمجھائے
اک لچکتی ہوئی تلوار کے معنی سمجھائے
خمِ کاکل، لب و رخسار کے معنی سمجھائے
تجھ کو خود بین و خود آرا و خود آگاہ کیا

تھی کبھی مجھ کو نہ کچھ جاہ کی حشمت کی تلاش
تھی کبھی مجھ کو نہ عزت کی نہ ثروت کی تلاش
دلِ انساں کی ضرورت تھی محبت کی تلاش
اور اس کھوج میں اس شہر تک آ نکلا تھا

یاں تو انسان کی عظمت بھی بکا کرتی ہے
دستِ فرہاد کی قوت بھی بکا کرتی ہے
اور سنتا ہوں محبت بھی بکا کرتی ہے
کون جانے کہ ترے دیس کی یہ ریت ہے کیا

یاں تو معصوم نگاہوں کا تصادم بھی نہیں
دل نشیں ناز و دل آویز تبسم بھی نہیں
ہم تو پہلے ہی سے بدلے تھے وہ اب تم بھی نہیں
نوعِ انساں میں خدا جانے تغیر ہے یہ کیا

کوئی طالب ہی نہیں رنگ و لطافت کا یہاں
کوئی قائل ہی نہیں رسمِ محبت کا یہاں
کوئی عادی ہی نہیں خُلق و مروّت کا یہاں
کتنی مغموم ہے، بے نور ہے یہ رُت یہ فضا

ہاں ترے شہر کی یہ رسمِ وفا خوب رہی
پیار کی بات کوئی نکلی تو معیوب رہی
ہر نظر کچلی گئی آہ بھی معتوب رہی
اور میں تیری عنایت کا طلب گار رہا

کتنی بے سود اُمیدوں نے اُبھارا تھا مجھے
کتنے بے ربط خیالوں کا سہارا تھا مجھے
ٹوٹتے دل نے عجب طرح پکارا تھا مجھے
اور اس ڈوبتی آواز کو دنیا نے سنا

اور میرا کوئی ہمدم کوئی دم ساز نہ تھا
تو بھی اس راہ سے گزری تو ادھر رُخ نہ کیا
کون جانے یہ ترے ذہن میں آیا ہو گا
دل ہے اک آلۂ جسم اس کی حقیقت بھی ہے کیا
"اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا"

◆◆

جدائی

(میرڈتھ کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

اور ہر بار ہوا کے جھونکے
کہہ رہے تھے کہ جدا ہوں گے ہم
سہم کر وہ مرے سینے سے لگی جاتی تھی

میں نے ہاتھوں میں لیے اس کے ہاتھ
اور پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں
......ایک انجانی سی بات

ایک پر ہول خیال......
......اور پھر جھیل سے آنکھوں کی مجھے
نظر آئے کئی اٹھتے ہوئے سنگین سے ہاتھ

......میری بگڑی ہوئی تقدیر کے ہاتھ
میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کو
(وہ گنہ جو مجھے ورثہ میں ملے تھے شاید)

......اور وہ ہاتھ مری سمت بڑھے آتے تھے
تاکہ چھینیں وہ مرے دل کا سکوں
اور نچوڑیں وہ مرے جسم سے ہر قطرۂ خوں
اور مری زیست کی تاریکی سے
میری امیدوں کی مہتاب کی ہلکی سی کرن بھی لے لیں
اور پھر دور بہت دور اسے لے جائیں

میں نے سوچا وہ حسیں خواب جسے
دن کے تخیل میں اور راتوں کی سرمستی میں
کبھی پروان چڑھایا میں نے
آج کس طرح وہ خود
اپنی تعبیر سے شرمندہ ہے............

میرے رنگین خیالوں کا محل
ایک جھٹکے میں زمیں بوس ہوا
اور نوخیز و جواں سال امیدوں کا گلا

وقت کے آہنی ہاتھوں نے وہیں گھونٹ دیا

مجھ پہ سکتا سا رہا
میں تو آنکھوں کے اشارے سے بھی کچھ کہہ نہ سکا
اور اک قطرۂ اشک
میرے اس لحۂ ہستی کا وقار
خشک مٹی پہ گرا......

◆◆

زہر کا سفر

میں انسان ہوں
میں نے اک ناگن کو ڈسا
اس کو اپنا زہر دیا
ایسا زہر کہ جس کا منتر کوئی نہیں
اس کی رگ رگ میں چنگاری
اس کے لہو میں آگ

میرے زہر میں نشہ بھی ہے
ایسا نشہ جس کا کوئی خمار نہیں
وہ ناگن اب مست نشے میں جھومے گی
بہک بہک کر ہر سو مجھ کو ڈھونڈے گی
اس کی زباں باہر کو نکلی
اس کے منہ میں جھاگ

آج ہے لوگو پورن ماشی
زخمی ناگن زہر اگلتی
انسانوں کو ڈس کے ان کے خون میں اپنا زہر بھرے گی
ایسا زہر کہ جس کا منتر کوئی نہیں
ان کی رگ رگ میں چنگاری
ان کے لہو میں آگ
اس کی زباں باہر کو نکلی
اس کے منہ میں جھاگ

مجھ کو ڈس کر میرے خون کو واپس میرا زہر کرے گی
میری رگ رگ میں چنگاری
میرے لہو میں آگ

◆◆

وطن کے لیے

یارب مری بہار کی میرے چمن کی خیر
صبحِ وطن کی خیر ہو شامِ وطن کی خیر

مٹی سے پھوٹتا ہے بہاروں کا بانکپن
اے میری ارضِ پاک ترے بانکپن کی خیر

کیا کیا مہک رہے ہیں گل و نسترن یہاں
پروردۂ بہار گل و نسترن کی خیر

کیا دمک رہا ہے مرا باغِ آرزو
ہاں میرے گلعذار مرے گلبدن کی خیر

کیا کیا مہ و نجوم سجاتے ہیں انجمن
یارب مہ و نجوم کی اس انجمن کی خیر

آئینہ رو و سرو قداں سے ہے کیا سماں
اس گلستانِ پاک کی سرو و سمن کی خیر

سرمہ ہے میری آنکھ کا میرے وطن کی خاک
یارب ہر ایک ذرّۂ خاکِ وطن کی خیر

فطرت بھی فن چھپائے ہے سو سو طرح یہاں
دریا و آبشار کی، کوہ و دمن کی خیر

پائی اسیرِ شوق نے آزادیِ جنوں
آئی بہار اب مرے دیوانہ پن کی خیر

اس سرزمیں سے پھوٹتے ہیں آرزو کے گیت
میرے وطن کی خیر، مرے فکر و فن کی خیر

باقرؔ دعائیں مانگ گلِ تازہ کی ہر آن
موضوعِ گل کی اور ترے طرزِ سخن کی خیر

◆◆

بلاعنوان

اٹھو کہ تاریخ کی جبیں کی شکن مٹانے کا وقت آیا
بڑھو وطن کا جو قرضِ جاں ہے اسے چکانے کا وقت آیا
بڑھو کہ تاریخ کے چمکتے ہوئے یہ لمحے تمہاری آمد کے منتظر ہیں
یہ لمحے جو ہر زماں کے تابندہ آسمانوں سے اترے تارے ہیں
روشنی کا پیام لائے ہیں
زندگی کا سلام لائے ہیں
ان کو دیکھو
یہ روشنی کی لکیر...... لمحے
ابد کے روشن سفیر...... لمحے
تمہاری آمد کے منتظر ہیں

یہ لمحے تاریخ کا وہ روشن ورق ہیں جن پر
حیاتِ انساں نے خوں سے پیغامِ حق لکھا ہے

غیور قوموں کی حریت کا سبق لکھا ہے

بڑھو کہ اب اپنے تازہ خوں سے حکایتِ جاں سپاری لکھنے کا وقت آیا

وہ حرف لکھو جو ہر زمانے میں تازہ خوں سے لکھا گیا ہے

وہ حرف لکھو جو ہر زماں، ہر مکاں کی تابندہ داستاں ہے

وہ حرف لکھو جو کربلا میں حسینؑ نے ریگِ گرمِ صحرا پہ لکھ دیا ہے

وہ حرف لکھو کہ جس سے باطل یزیدیت نشانِ حرفِ غلط کے مانند مٹ گیا ہے

ہماری تاریخ کی جبیں پر شکن پڑی ہے

اسے مٹانے ہم آگئے ہیں

وطن کا جو قرضِ جاں ہے ہم پہ

اسے چکانے ہم آگئے ہیں

یہ وقت ہے، ان چمکتے لمحوں سے روشنی لے کے خون تازہ کی سرخیاں دو

یہ وقت ہے، ان دمکتے لمحوں کو زندگی کے نئے نشاں دو

اٹھو کہ قومی شعور اب اک نئے اُفق کی تلاش میں ہے

چلو کہ سرحد پہ عزم و ہمت کا سیل طوفان بن چکا ہے

ہماری توپیں گرج رہی ہیں کہ آج وہ آگ اور خوں کی پیامبر ہیں

ہزار ہا جنگ جُو مجاہد، قدم قدم، دم بہ دم، ہواؤں کے ہم سفر ہیں

اور ان کی ٹھوکر میں کتنے کسریٰ ہیں، کتنے قیصر ہیں جن کے سَر ہیں

زمین پر گونجتے گرجتے ہزار ہا ٹینک چل رہے ہیں
فضاؤں میں آسماں کے مالک جہاز پہلو بدل رہے ہیں
ہمارے قبضے میں بحر و بر ہے
فضاؤں میں، دور آسمانوں میں، پاک پرچم بلند تر ہے

جسور سے تا کراچی، سلہٹ سے تابہ لاہور
سارے دل ایک ساز بن کر دھڑک رہے ہیں
کہ دھان کی فصل اور گندم کی بالیوں سے لہو جو بنتا ہے ایک سا ہے
ہمارے بچوں کی صورتیں اور ماؤں بہنوں کی عصمتیں، سب
ہماری زرتاب دلہنوں کا سہاگ...... گیتوں کا راگ
جوش اور ولولوں کا مزاج
اپنے خدا کی تائید پر بھروسا، سب ایک سا ہے

ہمیں یقیں ہے کہ قوم جو دشمنوں سے سینہ سپر ہے۔
خود اپنے دل کے شعلوں سے بن کے کندن دمک اٹھے گی
ہمیں یقیں ہے کہ قوم دریائے خوں سے ابھرے گی
آسماں پر ستارہ بن کر چمک اٹھے گی

◆◆

قائداعظم

(۱)

اے مرد خود آگہی و بے باک
تخلیق تری یہ خطۂ پاک
میں تیرے بغیر کیوں ہوں دل تنگ
کیوں آنکھ کروں میں اپنی نمناک
ہر دل پہ ترا ہی نقشِ محکم
ہر آنکھ میں تیرا عزمِ بے باک
یہ کیف تری عطا ہے جس سے
لہراتی ہے نشے میں رگِ تاک
کہتے ہیں بہار کا فسانہ
یہ میری زمیں کے خار و خاشاک
لکھی ہیں جنوں کی داستانیں
دیوانوں نے خوں سے برسرِ خاک

ہر شام ہے منتظر سحر کی
یہ صبح ہے روشنی کا انبار
مٹی میں نمو کی کروٹیں ہیں
ہر ذرّہ ہے اس زمیں کا بیدار
ہے نام ترا شعورِ ہستی
ہے کام ترا دلوں کو للکار
تاریخ کے صفحے پہ ترا حرف
تخلیق کا اک عظیم شہکار
جو جاں کے لیے تھا کیف پرور
جو دل کے لیے تھا جوشِ پیکار
اے بزمِ حیات پھر وہ نغمہ
اے عزمِ جہاد پھر وہ جھنکار

یادیں ہیں تری مرا خزانہ
روشن ترے نام سے ہے سینہ
ہم ہیں زرِ آگہی سے خوشحال
نکلا ہے دلوں سے وہ دفینہ
منجدھار میں اب نہ پھنس سکے گا
اب پار لگے گا یہ سفینہ

یاں پھر سے شراب حریت آئے
خالی نہ ہو دل کا آبگینہ
یاں پھر وہ اتحاد و تنظیم
ہم بھول نہ جائیں وہ قرینہ
پھر سے ہو چراغِ دل کی لو تیز
روشن رہے زندگی کا زینہ

میں تیری بقا کا ہوں منادی
تو میری حیاتِ نو کا پیغام
رگ رگ میں لہو اُبل رہا ہے
یہ تیری عطا یہ تیرا انعام
ہر سر میں شعور موجزن ہے
یہ تیرا سبق یہ تیرا اکرام
ہر دل میں سرورِ کامرانی
ہے یاد تیری شرابِ گلفام
اے قائدِ قوم تیرا آغاز
ہے قوم کو فالِ نیک انجام
روشن ہے جبینِ قوم کیسی
ہے اس پہ لکھا ہوا ترا نام

◆◆

قائداعظم

(۲)

وقت پہ درمانِ غم کا ہے مسیحائی کا دن
آج کا دن ہے دعاؤں کی پزیرائی کا دن
مقطعِ شب مطلعِ انوار و زیبائی کا دن
روشنی کا دن مری آنکھوں کی بینائی کا دن
آج کے دن صاحبِ فکر و نظر پیدا ہوا
چھٹ گئیں تاریکیاں نورِ سحر پیدا ہوا

قوم کی آنکھوں میں ہے تو دیدۂ بینائے قوم
تیرے دل کی روشنی ہے برسرِ سینائے قوم
سر کٹے کتنے امانت پر تری بابائے قوم
ہے ترے جذبِ دروں سے پختہ تر سودائے قوم
قوم کو تجھ سے نشانِ راہِ منزل مل گیا
ڈگمگاتی ڈولتی کشتی کو ساحل مل گیا

نام سے تیرے مقدس تر ہوئی ہے ارضِ پاک
جس کی مٹی سے جبینِ قوم روشن، تابناک
جان تک قربان ہے اس پر یہ ہے طرزِ تپاک
ہو گئی ہے لالہ گوں خونِ شہیداں سے یہ خاک
عظمتِ قومی کی یہ تازہ گواہی دیکھ لے
خون میں ڈوبا ہوا اِک اِک سپاہی دیکھ لے

قائد اعظم امانت ہے تری میرا وطن
شام اسکی مشک افشاں صبح بوئے نسترن
سرزمیں سے پھوٹتا ہے مہ وشوں کا بانکپن
آسماں پر سرخیِ خونِ شہیداں کی پھبن
یہ ہوائیں یہ فضائیں انجمن کی جان ہیں
میرے فن کی جان ہیں میرے سخن کی جان ہیں

گونجتا ہے نعرۂ عزم و یقین و اتحاد
زندہ باد اے نظمِ نو اے جہدِ پیہم زندہ باد
توڑ دیں گے ہم بنائے ظلم و بنیادِ فساد
بزم میں ہم جوشِ عشق و رزم میں شوقِ جہاد
اب ترے پیغام کی تفسیر بن جائیں گے ہم
تیرے زندہ خواب کی تعبیر بن جائیں گے ہم

ازسرِ نو تجھ سے پیمانِ وفا کرتے ہیں ہم
پھر دیارِ شوق میں رکھتے ہیں ہم اپنا قدم
روشنی دل کی بدل دیتی ہے تقدیرِ اُمم
ہم بھی بدلیں گے بہت لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم
دیکھ گلشن میں بہاریں رقص فرمانے لگیں
دیکھ پھر تازہ ہوائیں جھوم کر آنے لگیں

◆◆

زنجیر

میں خاموش کمرے میں خاموش دیوار کو تک رہا ہوں
کہیں ایک کونے میں مشغول مکڑا
نئے سرے سے جالے کو بُن
خود اپنے کمالات کو دیکھتا ہے
سوچتا ہے کہ کل مکھیاں
میرے اس جال میں پھنس کے
میری مہارت کے آگے
بڑے عجز سے سر جھکائے
میری بے پناہ قوتوں کو سراہیں گی
کبھی اپنی کھڑکی سے باہر
میں گہری گھنی رات کی ہولناکی پر خوش ہوں
کہ یہ لوگ جو تھوڑی ہی دیر پہلے
زندگی موت کی کشمکش سے پرے
خود کو محفوظ گردانتے تھے
کس قدر بے بسی سے

خود اپنے ہی بستر کی قبروں میں آرام سے سو گئے ہیں
میں یہ سوچتا ہوں کہ میں صُور پھونکوں
تو بے چارے اٹھ کر میرے سامنے
نیکیوں اور گناہوں کا کھاتہ لیے آ کھڑے ہوں
مگر اب سمجھتے ہیں وہ اپنی قبروں میں محفوظ ہیں
جیسے ان کو خبر ہے قیامت بہت دور ہے
کبھی اپنی سگریٹ پہ جمتی ہوئی راکھ کو دیکھتا ہوں
کبھی نیلے نیلے دھوئیں کو جو منہ سے نکل
مختلف دائروں میں ادھر سے ادھر پھیلتا ہے
اور اسی طرح پھر پھیلتے پھیلتے
میری نظروں سے اوجھل ہوا جا رہا ہے
یہ کیا ہے؟
یہ مری زندگی ہے
میری اور تیری یہی زندگی ہے
جو ہر سمت پھیلے گی اور پھیلتے پھیلتے
اس دھویں کی طرح
خلاؤں میں تحلیل ہو جائے گی
میں خاموش کمرے میں خاموش دیوار کو تک رہا ہوں
اور دیوار کے ساتھ خود میری تصویر
میری ہی بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے

پوچھتی ہے
تمھیں فکر کیا ہے
بہت دیر سے گھر کو لوٹے ہو
چپ چپ ہو کیا سوچتے ہو
یہی نا کہ اک دن تم اس حال میں تھے تو وہ آ گئی تھی
بڑے پیار سے اس نے بالوں کو سلجھا دیا تھا
تمھیں پیار سے کہا تھا
تمھیں کون سی بات خوش رکھ سکے گی
بتاؤ، بتاؤ تمھیں کون سی شے کی آخر طلب ہے
یہی نا کہ تم زندگی سے بہت تنگ ہو
تو مرجاؤ لیکن تمھیں یہ خبر ہے کہ جو مر گئے ہیں انھیں
موت نے کیا دیا ہے
مگر جینے والوں کو بھی زندگی کچھ نہیں دے گی
جو مرتے ہیں وہ کل بھی مرتے
جو جیتے ہیں وہ کل بھی ہوں گے
جو پچھتاوا کل ہو گا سو آج بھی ہے
جو کل تھا وہی کل بھی ہو گا
تو پچھتاوا ہی اک حقیقت ہے
جو جینے پہ پچھتا رہے ہو
تو مر کر بھی پچھتاؤ گے

اسی شہر میں ایک تاجر تھا
جو مال و دولت کے انبار سے کھیلتا تھا
جسے کل کا دُکھ تھا نہ کچھ آج کا غم نہ کل کی کوئی فکر تھی
وہ تاجر ہر اک کامیابی کے ہر راز سے آشنا تھا
اسے کوئی پچھتاوا ہوتا تو کیسے
وہ آسودہ، دنیا کے سارے مصائب سے بے گانہ یہ سوچتا تھا
کہ اب کے یہ دو چار دس لاکھ نوٹوں کے مینار کو کتنا اونچا
کریں گے
اور اک دن عجب حادثہ پیش آیا
وہ اک صبح جب سو کے اٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے
مگر وہ نہ چونکا
نہ مرنے کی اپنے خبر اس نے اخبار میں دی
نہ کچھ اس کے معمول میں فرق آیا
یہی حال اپنا بھی ہو گا
جو تم اپنے دُکھ، اپنے پچھتاوے بھولے تو یہ یاد رکھو
کسی صبح سو کر اٹھو گے
تو دیکھو گے تم مر چکے ہو
تمھیں اپنے مرنے کی کوئی خبر بھی نہ ہو گی
تمھیں اپنے جینے کی اس آن کچھ تو خبر ہے

سوچتا ہوں

مجھ سے مت پوچھ اے مرے ہمدم
مجھ سے مت پوچھ سوچتا کیا ہوں

سوچتا ہوں کہ مجھ کو ورثے میں
صرف لے دے کے ایک غم ہی ملا
سوچتا ہوں کہ زندگی میں کبھی
مجھے احساسِ زندگی بھی ہوا

سوچتا ہوں کہ وہ بھی ہیں انساں
زندگی سے جو رہتے ہیں بیزار
جن کی آنکھیں ہیں نور سے خالی
جن کا دل مردہ حسرتوں کا مزار

سوچتا ہوں کہ یہ جواں چہرے
کیوں فسردہ، اداس رہتے ہیں
کس لیے قصد میں امیدوں کے
دیو صد رنج و یاس رہتے ہیں

سوچتا ہوں کہ یہ کلرکی بھی
میری ہستی پہ ایک تہمت ہے
ذہن و احساس کی گراں باری
پیٹ بھرنے کو ایک لعنت ہے

سوچتا ہوں کہ میری صورت میں
کاش کچھ جذب کچھ کشش ہوتی
پھر اس احساسِ کمتری کے بجائے
ذہن کی اور کچھ روش ہوتی

سوچتا ہوں کہ یہ غمِ ہستی
اپنے دم سے تو کچھ غنیمت ہے
ہاں مگر وہ گھنی گھنی پلکیں
جن سے ہستی مری عبارت ہے

سوچتا ہوں کہ ان کی زلفوں میں
کتنے بل آج پڑ گئے ہوں گے
سوچتا ہوں سنورنے سے پہلے
کتنے گیسو بگڑ گئے ہوں گے

سوچتا ہوں کہ کس طرح ان سے
حال کچھ دل کی دھڑکنوں کا کہوں
اور پھر عرضِ مدعا کا طریق
ہونا کیا چاہیے ہے یوں یا یوں

سوچتا ہوں کہ ان سے یہ کہہ دوں
کچھ مجھے آپ سے عقیدت ہے
ہر نظر، ہر ادا ہے دل کو عزیز
کیا مجھے آپ سے محبت ہے؟

سوچتا ہوں کہ کہہ سکوں گا کبھی
بات یہ اتنی ہی صفائی سے
سامنے ان کے کھل سکے گی زباں
بن سکے گا پہاڑ رائی سے

سوچتا ہوں جہاں میں کاش کوئی
کر لے محسوس میرے دل کی دُکھن
کاش آ جائے میرے دل کے قریب
جان لے میرا رازِ فکر و محن

سوچتا ہوں کہ بھاگ جاؤں کہیں
اس جہاں سے پناہ لینے کو
آج تک جس کے ہر اشارے پہ
آگے بڑھتا ہوں جان دینے کو

سوچتا ہوں جہاں کا یہ دستور
کس نے اس طرح ہم پہ ڈالا ہے؟
یہ مشیّت ہے یا معیشت ہے؟
دہر میں کس کا بول بالا ہے؟

سوچتا ہوں کہ دشمنی کیوں ہے؟
سوچتا ہوں کہ رہزنی کیوں ہے؟
سوچتا ہوں کہ تیرگی کیوں ہے؟

سوچتا ہوں کہ دوستی کیا ہے؟
سوچتا ہوں کہ رہبری کیا ہے؟
سوچتا ہوں کہ روشنی کیا ہے؟
سوچتا ہوں کہ آدمی کیا ہے؟
سوچتا ہوں کہ زندگی کیا ہے؟

◆◆

مگر وہ اک خلشِ دل

بہت دنوں سے مری طبعِ شعر و نغمہ میں
کسی رباب کی راگنی کی بات نہیں
بہت دنوں سے تغزل کی بزم سونی ہے
کسی شباب کی چاندنی کی بات نہیں

بہت دنوں سے نہیں بات شوخیِ لب کی
کسی نکھار کی تازگی کا ذکر نہیں
ادھر چڑھے نہیں افسانہ ہائے زلفِ دراز
کسی بناؤ کسی برہمی کا ذکر نہیں

بہت دنوں سے نہیں خوفِ طعنہ و دشنام
میں خود کہوں مجھے رسمِ وفا کا پاس نہیں
بہت دنوں سے ہے زعمِ خود آگہی مجھ کو
بہت دنوں سے کوئی عرض و التماس نہیں

میں شورشِ غمِ دوراں سے بے خبر ہو کر
ترے جمال کی رنگینیوں میں کھو نہ سکا
غمِ حیات نے گہرے کثیف زخموں کو
غمِ حبیب کے گرم آنسوؤں سے دھو نہ سکا

مجھے یہ فخر ہے میں نے ترے سنورنے کو
خود اپنے نغموں کی کلیوں کا ہار بھیجا ہے
مجھے یہ فخر ہے تخیل کے گلستاں سے
ترے حضور پیامِ بہار بھیجا ہے

تجھے لطیف کنایوں سے حسن بخشا ہے
کلی کا رنگ، گلوں کی شگفتگی دی ہے
ترے حسین اشاروں کا آسرا لے کر
سحر کا نور، ستاروں کی روشنی دی ہے

دھلائے چاندی کے پانی سے صندلیں رخسار
کہ ماہتاب کی تابانیوں کو رشک آئے
جبینِ ناز پہ افشاں چنی ستاروں کی
کہ کہکشاں بھی محبت کے پھول برسائے

خود اپنے دل سے مجھے آج یہ شکایت ہے
کہ تیری بارگہِ ناز سے بھی گھبرایا
کبھی ملے گی جو فرصت تو خود سے پوچھوں گا
تری گلی سے کئی بار کیوں پلٹ آیا

تلاشِ ربطِ نہاں جانِ آرزو مت کر
کہ تیرا ناز بجا وہ مرا نیاز کہاں؟
غرورِ حسن کے انداز سب وہی لیکن
وفائے عشق کا وہ عزمِ پاکباز کہاں؟

بھڑک کے آتشِ جاں سوزِ عشق سرد ہوئی
شعاعِ حسن کی تابندگی تو دائم ہے
حضورِ یار وہ دل کے معاملے نہ رہے
مگر وہ اِک خلشِ دل کہ اب بھی قائم ہے

◆◆

جامہ زیبی

جسے سجا کر میں جسم پر اپنے آپ کے روبرو گیا تھا
جسے پہن کر بصد نیاز و بہ منّت و آرزو گیا تھا

جو زیب تن تھی میں جب طلسمِ خیال میں گم کبھی ہوا تھا
جو زینتِ جسم و جاں تھی جب میں شکار خود آگہی ہوا تھا

جو اک لبادہ تھی سحر کا اس طلسم خانے میں سیم و زر کے
جہاں کے "سم سم" سے آدمی بھی خدا نہیں عالمِ نظر کے

میں یہ سمجھتا تھا اس لبادے سے اک نئی زندگی ملے گی
کبھی نگارِ شفق ملے گی کبھی حسیں چاندنی ملے گی

میں اب یہ سمجھا کہ یہ بھی اک خوابِ حاصلِ وہمِ دل نشیں تھا
میں اب یہ سمجھا کہ یہ فریبِ خیال بھی کس قدر حسیں تھا

کہاں وہ کم خواب جس پہ اک لحظہ آپ کی بھی نظر ٹھہرتی
کہاں سے وہ راہ دل میں ہوتی جو آپ کی رہگزر ٹھہرتی

میں سوچتا تھا اُجاڑ جیبیں کبھی یکا یک کھنک اٹھیں گی
میں سوچتا تھا مرے تصور کی ساری کلیاں مہک اٹھیں گی

مگر مری حسرتیں بھی احساسِ وقت سے خود سمٹ گئی ہیں
مگر مری بے نیاز جیبیں خود اپنی ہی ضد میں پھٹ گئی ہیں

◆◆

احساس

کچھ حسیں خواب تھے جو فسردہ غم انگیز تاریک راتوں کے انبار میں سو گئے
کچھ فسانے چلے جو غمِ زندگانی کی پر پیچ راہوں میں جانے کہاں سو گئے
اور میں ایک بے یار و تنہا مسافر کئی راستوں پر بھٹکتا رہا
اور میں شہر کی اجنبی رہگزاروں پہ انجان چہروں کو تکتا رہا
کون تھا جو مرے درد کو جانتا
کون تھا جو مری روح کے کرب کو
میرے احساس کے شیشۂ نرم و نازک میں پہچانتا
میرے احساس کا شیشۂ نرم و نازک تو ہر گام پر چُور ہوتا رہا
اور ہر گام پر آہنی قہقہوں کا ہر اک وار بھرپور ہوتا رہا
اور میں اپنے سینے کے ہر زخم کو گرم اشکوں کے پانی سے دھوتا رہا
اور میں تنگیِ دل کی بنجر زمیں پر محبت کے کچھ بیج بوتا رہا
اور مجھے پھل ملا زخمِ احساس کا

اور مجھے پھل ملا موت کی آس کا
اور مجھے تُو ملی
ایک لمحہ ہنسی کی طرح
اور ملتے ہی جانے کہاں کھو گئی
میں نے ڈھونڈا تجھے محفل وماہ میں
میں نے تاروں کی دنیا میں آواز دی
اور میں یہ نہ سمجھا کہ تو یک بیک
سیم وزر کی ہنسی اور گھنی چھاؤں میں
ایک بے مہر، بے روح آواز پر
ایک بے کیف سے نغمہ ساز پر
گھوم کر اک طرف ہو گئی
اور پھر اک خنک سرد آغوش میں
ڈوب کر سو گئی
اور میں ایک بے یار و تنہا مسافر کئی راستوں پہ بھٹکتا رہا
اور میں شہر کی اجنبی رہگزاروں پہ انجان چہروں کو تکتا رہا
اور ہر موڑ پر
میں نے دیکھا کہ کچھ جسم بے جان سے

بے طلب، بے ارادہ ہی مڑتے رہے
میں نے دیکھا کہ عفریت پر تولتے
آسماں پر ہر اک سمت اڑتے رہے
اور سڑکوں پہ بکھری ہوئی ہڈیاں
خود کو وحشی گِدھوں سے بچانے کی خاطر
سمٹنے لگیں، رینگ کر آگے بڑھنے لگیں
اور میں نے یہ جانا کہ میں اک ہیولا ہوں، بے جسم، بے روح، بے جان ہوں
اور یا پھر زمیں سے پرے ایک اڑتا بگولا ہوں اور رہگزاروں کا
طوفان ہوں
اور میں بس اسی طرح بے آسرا، بے سہارا ہر اک گام چلتا رہا
اور دل روزِ فردا کی امید پر ڈوبتے بھی سنبھلتا رہا
اور میں ایک بے یار و تنہا مسافر کئی راستوں پر بھٹکتا رہا
اور میں شہر کی اجنبی رہگزاروں پہ انجان چہروں کو تکتا رہا
کون تھا جو مرے درد کو جانتا؟
کون تھا جو مرے درد کو جانتا؟
کون تھا جو مرے درد کو جانتا؟

◆◆

کشمکش

لوگ تاروں پہ کمندیں پھینکیں
اور ہم خاک بسر، خاک نگر
اک لگن دل میں لیے خستہ جگر
چاند کی آگ سے آنکھیں سینکیں

....

دل یہ کہتا ہے سجے بزمِ خیال
کوئی نرگس ہو کہ سنبل کہ گلاب
سیم بر کوئی، کوئی غرقِ شراب
دل یہ کہتا ہے بڑھے ذوقِ جمال

....

ذہن کہتا ہے، چڑھے رنگِ کمال
آسماں منتظرِ انساں ہے
کہکشاں کب سے تہی داماں ہے
دے زمیں مژدۂ فردوسِ جمال

....

ذہن و دل کشمکشِ زیست سے چُور
دل ادھر زخمۂ مژگاں سے نڈھال
ذہن ادھر کارِ جہاں سے بے حال
ذہن تاریک ہے دل ہے بے نور

....

چوم لے کوئی رُخِ ماہِ تمام
اور ہمیں ذوقِ نظر سے بھی گریز
روئے تابانِ سحر سے بھی گریز
شب کے محکوم اندھیروں کے غلام

....

پھر وہی بے پر و بالی و قفس
پھر وہی یورشِ غم ہائے زمیں
وہی پامالیِ احساسِ حسیں
کون سنتا ہے یہ آوازِ جرس

....

جس کی قسمت میں ہو منزل وہ چلے
کچھ تو باعزمِ سفر بیٹھے ہیں
ہم سرِ راہگور بیٹھے ہیں
سینکڑوں سال کے برگد کے تلے

....

آسماں سے کوئی دیتا ہے ندا
چاند کی بولتی خوشبو تو نہیں
کوئی جاگا ہوا جادو تو نہیں
دل سے آتی ہے دھڑکنے کی صدا

◆◆

سوال

سال آتے رہے، سال جاتے رہے
ان گنت سال اور زیست کٹتی رہی
پہلے بچپن گیا، اب جوانی چلی
اور ہم ذہن کے تنگ و تاریک غاروں میں بُنتے رہے ایک باریک جال
اور اُبھرتے رہے ذہن کے تنگ و تاریک گوشوں سے کتنے ہی مبہم سوال

زیست کیا اک معمّا ہے جس کے لیے
ہم حقائق بہرطور یکجا کریں
اور پھر ہر حقیقت اضافہ کرے
اک نئے باب کا، اک نئے خواب کا
اور اسی طرح کٹتی رہے زندگی، اور پھر مرتے دم تک رہے یہ خیال
زندگی کو سکوں مل سکے گا کبھی، پاسکیں گے کوئی حل کبھی وہ سوال

جن کو اک عمر یہ ذہن بُنتا رہا
قصرِ تخیل تعمیر ہو جائے گا
جس کی ہر اینٹ یہ ذہن چُنتا رہا
ہر سوال اپنے ساتھ ایک حل لائے گا، اور ہر حل نیا اک سوال
اور کٹتی چلی جائے گی ہر گھڑی، عمر کی ہر گھڑی اک مجسم وبال

ذہن کی یہ تگ و دو بھلا کس لیے؟
کس لیے زندگی اے خدا کس لیے؟
زندگی کا ہے کیا بس یہی مدعا؟
تیری دنیا کی کیا ریت ہے اے خدا؟

◆◆

میرے چمن، مرے وطن

میرے چمن، مرے وطن، میری حیات کے نشاں
میری طلب کے رازداں، میری وفا کے پاسباں

تیری فضائیں نغمہ ریز، تیری ہوائیں نشہ خیز
ارضِ نیازِ عاشقاں، ارضِ خرامِ گل رُخاں

موجِ ہوائے پاک سے سرخیِ چہرۂ جمال
خاکِ زمینِ پاک ہے سرمۂ چشمِ دلبراں

شوخیِ شاخسارِ گل عہدِ بہار کی امیں
بلبلِ شکوہ سنج اب گل سے نہیں ہے سرگراں

شوق کی بے کلی لیے باغ کی ہر نئی کلی
ہر گلِ نو شگفتہ ہے دورِ جنوں کی داستاں

میری عروسِ نوبہار، ہم ہیں بہت وفا شعار
تیری حنائے پا کو ہیں خونِ جگر کی سرخیاں

راہ میں تیری مخملیں سبزۂ نو کا فرش ہے
سر پہ ترے سجا ہوا لالہ و گل کا سائباں

کھل کے نہ کہہ سکے کبھی واہ رے احتیاطِ شوق
دل کی ہر ایک بات پر کھل نہ سکی کبھی زباں

ہاں مگر اتنی عرض ہے، اے میری ارضِ پاک سن
ہم بھی ترے نقیب ہیں گو کہ ہیں گردِ کارواں

دیوارِ قہقہہ

ادھر نہ آؤ
کہ یہ محل اب شکستِ شوکت کی داستاں ہے
کہ یہ محل اب شکستِ اقدار کا نشاں ہے
کہ یہ محل اب شکستِ افکار کی فغاں ہے

ادھر نہ دیکھو
کہ یہ کھنڈر ہے جنوں کا، بھوتوں کا آستاں ہے
کہ یہ امنگوں کی بے بسی کی بڑی طویل ایک داستاں ہے
کہ یہ ہے مسکن سیاہ راتوں کا، ہر طرف بس دھواں ہے

ادھر نہ جھانکو
شکستہ اینٹوں کی اِن درازوں میں چاندنی بھی سسک رہی ہے
اندھیری راتوں کی کالی ناگن سیاہیوں میں چمک رہی ہے
کرن کرن کا لہو پیے ہے تو مست ہے اور بہک رہی ہے

جو پہلے تم اس محل میں آتے
تو رنگ و نغمہ کے سیلِ پر نور سے گزرتے
تو آرزو کی شراب میں ڈوبتے اُبھرتے
رسیلی بانہوں میں میٹھے سپنوں کی، ڈوب کر کس سکوں سے مرتے

جو پہلے اس سمت سے گزرتے
تو آرزوؤں کے نغمۂ دل نشیں کو سُنتے
بہت ہی روتے اور آنسوؤں سے کئی نئے خواب اپنے بنتے
اور ایک بے نام کیف مستی میں ڈوب کر اپنے سر کو دُھنتے

جو پہلے اس در کو کھٹکھٹاتے
حسیں امیدوں کے پاسباں تم کو رنگ و بو کا پیام دیتے
ہرے بھرے سرو تم کو گلہائے آرزو کا سلام دیتے
یہ بام و در ہنس کے تم کو پریوں کے شاہزادے کا نام دیتے

اور اب جو آئے ہو کیا ملے گا؟
نگار خانہ اُجڑ چکا ہے، وہ ساری محفل اکھڑ گئی ہے
وہ نکہتِ آرزو بھی دیوانہ وار ہر سو بھٹک رہی ہے
امیں تھی جو دردِ بیکراں کی وہ آہ گھٹ گھٹ کے مر چکی ہے

اور اب یہاں کس کو ڈھونڈتے ہو؟
یہاں پہ تم چیختے رہو گے، جواب کوئی نہیں ملے گا
یہاں پہ تم ڈھونڈتے رہو گے پہ خواب کوئی نہیں ملے گا
یہاں پہ شعر و شراب و چنگ و رباب کوئی نہیں ملے گا

یہاں پہ کس کو بلا رہے ہو؟
یہاں تمھاری صداؤں کے خول گونج بن کر اڑا کریں گے
وہ کھوکھلی گونج تم سے پوچھے گی "آپ یاں آ کے کیا کریں گے"
ڈرو گے خود اپنے سایے سے تم تو بھوت تم پر ہنسا کریں گے

ادھر نہ آؤ

ادھر نہ آؤ، یہاں پہ تم آ کے کیا کرو گے؟
یہاں پہ بھوتوں کا رقص دیکھو گے اور پھر آپ ہی ڈرو گے
ڈرو گے یا کالے کالے سایوں کا رقص
دیوار کی درازوں سے دیکھ کر تم بہت ہنسو گے
بہت ہنسو گے
یہ ایک دیوارِ قہقہہ ہے

مولانا صلاح الدین احمد
کی خدمت میں

مسجد میں شیخِ شہر کا عالی مقام ہے
مے خانے میں شریعتِ رندی حرام ہے

لفظوں میں روشنی کا تقاضا نہیں یہاں
مُردوں میں زندگی کی تمنا نہیں یہاں

ہر موج رنگِ کم نگہی سے حقیر ہے
ہر جلوہ تیرگی کی فضا میں اسیر ہے

میں تجھ سے ہم کلام ہوں اے پیرِ میکدہ
میرے لیے بھی جامِ نوائے بلند لا

دے مجھ کو جامِ عزمِ صدائے جگر خراش
ہاں کر دے میرے ظرفِ خموشی کو پاش پاش

عرضِ ہنر میں کوہِ وفا پر ہو تیشہ زن
پھر دیکھ جوئے شعر کی بڑھتی ہوئی پھبن

یہ گونجتی فضائے سخن تیرے دم سے ہے
یہ گیت سازِ زیست پہ اس زیر و بم سے ہے

ان راستوں میں کاوشِ رنج و الم بھی ہے
ہاں ان میں آزمائشِ دار و رسن بھی ہے

مانا صدائے تیشہ خرد کو ہے ناپسند
ہوتی ہے اوجِ دار پہ آوازِ حق بلند

یہ نطق و لب ہیں حرمتِ تقریر کے لیے
یہ کلکِ دلنوازیِ تحریر کے لیے

کہتے رہے فسونِ تمنا کی داستاں
"لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں"

ہر چند جرمِ حرفِ تمنا رقم ہوئے
"ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"

◆◆

پھیری والا

پریت نگر سے پھیری والا میری گلی میں آیا
چوڑی، لونگ، انگوٹھی، چھلّے رنگ برنگے لایا
میں نے پوچھا اور بھی کچھ ہے، بولا میٹھا سپنا
جس کو لے کر جیون بھر اک نام کی مالا جپنا

میں نے کہا کیا مول ہے اس کا، بولا اک مُسکان
تن میں آگ لگاؤ اس سے رکھو من کی آن
سستا سودا دیکھ کے آخر میں پگلی مسکائی
جیون بھر کا روگ سمیٹ کے میں کیسی اٹھلائی

رہے گا لال گلاب سا سپنا کب تک میرے سنگ
کب تک اس میں باس رہے گی، کب تک اس میں رنگ
اس کے تار بکھر جائیں گے کب میرا دل مانے
دل پہ رہے گا کب تک جادو پھیری والا جانے

◆◆

صبح

آخرِ شب تھی
وہ صحنِ مسجد میں بے سدھ پڑا سو رہا تھا
میں نے اس کو جگایا
اُٹھ......
یہ شہادت کا تکبیر کا وقت ہے
دعاؤں کی تسخیر کا وقت ہے
وہ اٹھا...... میرا قاتل جسے میں نے خود ہی اٹھایا
اٹھا......
اور محرابِ مسجد میں میرے لہو سے چراغاں ہوا

◆◆

شام

دن کو اس کا لہو تھا ارزاں
پھر آئی یہ شامِ غریباں
طوق گلے میں، پاؤں بہ جولاں
صبر ہے گریاں، ظلم ہے خنداں
شام ہوئی

کرب و بلا، سناٹا ہر سو
ہر سو اس کے لہو کی خوشبو
میری آنکھیں اس کے آنسو
میرے لفظ اور اس کے جادو
شام ہوئی

◆◆

رات

آندھیاں آسمانوں کا نوحہ زمیں کو سناتی ہیں
اپنی گلوگیر آواز میں کہہ رہی ہیں،
درختوں کی چنگھاڑ
نیچی چھتوں پر یہ رقص آسمانی بگولوں کا
اونچی چھتوں کے تلے کھیلے جاتے ڈرامہ کا منظر ہے
یہ اس ظلم کا استعارہ ہے
جو شہ رگ سے ہابیل کی گرم و تازہ لہو بن کے اُبلا ہے
آندھیوں میں تھا اک شورِ کرب و بلا
اور میں نے سنا کربلا...... کربلا
رات کے سہم سے، اَن کہے وہم سے
بند آنکھوں میں وحشت زدہ خواب اترا
صبح اخبار کی سرخیاں بن گیا

◆◆

ایک نظم

چمن میں زینتِ امید اوجِ سرو خیال
محیطِ دشت میں رم خوردہ حسرتوں کے غزال
کہیں ہے بوئے فراق اور کہیں ہوائے وصال

کہیں ہے ساقیِ مہوش فروغِ بادۂ جام
کہیں ہے نغمۂ مطرب میں ڈوبتی ہوئی شام
کہیں سپیدیِ صبحِ بہارِ دل آرام

کہیں خدا سے تکلم کہیں بتوں سے نیاز
کہیں حیات کی تفسیر موت کی آواز
کہیں پہ نقشِ حقیقت کہیں فسونِ مجاز

کہیں اسیریِ زلفِ دراز کا مضموں
کہیں ہوائے سرِ رہگزار کا افسوں
کہیں خزاں کا تسلط کہیں بہار کا خوں

ہوائے نجد اڑاتی ہے خاکِ قیس کہیں
صدائے تیشۂ فرہاد سن رہی ہے زمیں
کہیں ہے دل کا خرابہ جہاں پہ کوئی نہیں

جو کھل گیا درِ زنداں تو موت سے تعبیر
ہوا جو چاک گریباں تو صبح کی تفسیر
قدِ دراز بنا دار، زلف ہے زنجیر

ہزار رنگ ہیں نکھری ہوئی فضاؤں میں
ہزار راگ سنکتی ہوئی ہواؤں میں
ہزار طرز مہکتی ہوئی اداؤں میں

اسی دیار کو جائے سکونِ جاں کہیے
اسی نگار کو سرتاجِ دلبراں کہیے
اسی سے حالِ دل و دردِ دوستاں کہیے

ہزار شورشِ ایام رام ہیں بدل است
دریں زمانے رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل است

◆◆

تنکا

موج پر تھا سوار اک تنکا
اس بچارے کی تھی بساط ہی کیا

ہاں مگر تند و تیز لہروں سے
پیچھے رہنا نہ اس نے سیکھا تھا

بہتے پانی کے تیز دھارے پر
موجِ خود سر کے ہر اشارے پر

بہتا جاتا تھا، سوچتا تھا مگر
کسی صورت لگوں کنارے پر

اسی اثنا میں اس نے کیا دیکھا
سامنے اک جہاز آتا ہے

جس سے ہر موج خوف کھاتی ہے
شان سے ہر قدم اٹھاتا ہے

موجِ طوفاں سے کچھ نہیں ڈرتا
جیسے حاکم ہو وہ سمندر کا

کچھ جھجک ہے نہ کچھ پریشانی
دل ہو ظالم کا جیسے پتھر کا

جہدِ پیہم سے چور تنکے نے
سوچا میں بھی جہاز سے لگ جاؤں

اور شاید اسی طرح اک دن
اپنی منزل کا راستہ پاؤں

دم میں دم آیا اس سہارے سے
اور کچھ دن یونہی بہتا رہا

لیکن اس سنگ دل جہاز نے بھی
بیچ دھارے میں اس کو چھوڑ دیا

آئی اک موج تیز، یہ مجبور
اس کے رحم و کرم پہ بہہ نکلا

ہاں مگر دور سے یہ دی آواز
تم سمجھتے ہو ڈوب جاؤں گا

تم سہارا نہ دو مگر پھر بھی
زندگی میں وہ دن بھی آئے گا

جبکہ طوفانِ بحر خود مجھ کو
راہ میں مشعلیں دکھائے گا

◆◆

"ٹلّو ۔ ملّو"

ٹلّو، ملّو ہیں دو بھائی
کھاتے ہیں جو دودھ ملائی
کہنے کو شیطان نہیں ہیں
پھر بھی وہ انسان نہیں ہیں
پیڑوں پر وہ چڑھنے والے
کوّوں سے وہ لڑنے والے
بلّی کو دھم سے دے ماریں
کتّے کی وہ کھال اتاریں
تتلی ان کو دیکھ کے بھاگے
مرغی ان کے پاس نہ آئے
چھپّر پر وہ چڑھ جائیں گے
چوہوں سے آگے بڑھ جائیں گے
اس پر آئے، اس کو توڑا
اس پر لپکے، اس کو مروڑا
ایک گھڑی کو چین نہ لیں گے
ہر اک کو وہ تنگ کریں گے

دن بھر کرتے دھینگا مشتی
لپا ڈگی، کشتم کشتی
خوب بناتے ہیں وہ باتیں
کاٹتے ہیں باتوں میں راتیں
کہنے کو وہ پاس کھڑے ہیں
اک چھوٹے ہیں ایک بڑے ہیں
شیطانی میں دونوں برابر
دونوں اعلیٰ دونوں برتر
باہر سے لڑ کر آئے ہیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں
امی کے پاس آیا مقدمہ
دیکھیں اب کیا فیصلہ ہو گا
لو امی نے حکم سنایا
"جو کوئی جا کر بیٹھے گا
شور ذرا سا بھی نہ کرے گا
شام کو اس کو کیک ملے گا"
منلو آ کے پلنگ پہ لیٹے
ٹلو جا کر میز پہ بیٹھے
اب شاید سو جائیں گے منلو
اپنا سبق دہرائیں گے ٹلو

◆◆

ہمت

کسی جنگل میں اک لکڑہارا
بوجھ سر پہ لیے تھکا ہارا
گھر کی جانب قدم اٹھائے ہوئے
چل رہا تھا نظر جھکائے ہوئے
بوجھ سے تھا کمر میں اس کے خم
راہ تاریک تھی جو آنکھ تھی نم
راستہ تھا بہت ہی دور دراز
اس کے کانوں میں آئی یہ آواز
”کیسے طے کر سکو گے یہ منزل
اتنی محنت کا کیا بھلا حاصل
پھینک دو بوجھ، راہ ہو آسان
ساری دنیا سے قیمتی ہے جان“
ایک سایہ سا آ گیا نزدیک
راستہ اور ہو گیا تاریک

جب وہ آگے بڑھا تو کیا دیکھا
دیو تھا ناامیدیوں کا کھڑا
اب وہ آگے نہ بڑھ سکا مطلق
خوف سے اس کے منہ کا رنگ تھا فق
بوجھ سر کا زمیں پہ دے مارا
لمحہ بھر کو وہیں پہ بیٹھ گیا
پھر یکایک خیال آ ہی گیا
بیوی بچوں کے دن کے فاقے کا
آنکھ اٹھائی تو کچھ ہوا حیران
دور سے روشنی کے پائے نشان
کوئی آتا تھا مشعلیں لے کر
خوبصورت، حسین سا پیکر
آ کے نزدیک یوں ہوا گویا
"میں فرشتہ ہوں عزم و ہمت کا
ٹوٹتی آس جوڑتا ہوں میں
ناامیدی کو توڑتا ہوں میں
میرے دامن کو اپنے ہاتھ میں لے
زندگی کا نشان ساتھ میں لے
اٹھ کے یہ بوجھ اپنے سر پہ اٹھا
اور منزل پہ گامزن ہو جا

میں تجھے راستہ بتاؤں گا
راہ میں مشعلیں دکھاؤں گا"
مسکرا کر اٹھا لکڑہارا
بوجھ لکڑی کا اپنے سر پہ لیا
پھر فرشتے کے ساتھ ساتھ ہوا
اپنے قدموں کو اور تیز کیا
آئی منزل بھی سامنے سے نظر
خوش ہوا دیکھ کر وہ اپنا گھر
وہ جو لیتے ہیں کام ہمت سے
باز آتے نہیں ہیں محنت سے
راستوں کو وہ موڑ دیتے ہیں
فاصلوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں
وہ پہنچتے ہیں اپنی منزل پہ
مسکراتے ہیں لفظ مشکل پہ
اور کچھ، ان کے منہ کو تکتے ہیں
راہ میں ہر طرف بھٹکتے ہیں/

◆◆

دھنو چچا کی موٹر

دھنو چچا کی موٹر پر
ہم تھے سب سے پہلے اندر
امی اور آپا بھی آئیں
مجو کو بھی ساتھ میں لائیں
چچی اور چچا بھی بیٹھے
ٹنو پہلے سے جا لیٹے
ٹنو میاں کو کون اٹھائے
سر پہ قیامت کون بلائے
خالو نے جب جگہ نہ پائی
سر پہ لپیٹی اپنی رلائی
پھر سامان کا خانہ کھولا
خود کو اندر اس کے ڈھکیلا
سب سے بعد میں بابا آئے
اک گٹھڑی میں لڈو لائے

"بابا آئے لڈو لائے"
یہ ہم سب مل کر چلائے
لو ذکو شدو بھی آئے،
ان کو کہاں پر کوئی بٹھائے
آپا کی گود میں لپکے ذکو،
گردن پر چڑھ بیٹھے شدو
بابا نے جب جگہ نہ پائی
موٹر میں اک رسی باندھی
اور پھر اس رسی کو پکڑ کر
وہ جا بیٹھے گاڑی کی چھت پر
اب موٹر نے حکم جو پایا
دھک دھک کر کے قدم بڑھایا
ایک دفعہ وہ پیچھے کھسکی
اور جلدی سے آگے لپکی
پھر وہ اک دم پیچھے کھسکی
اور اب اپنی جگہ لوٹ آئی
بڈھے نتھو نے بہتیرا
اس کو ڈرایا اور دھمکایا
پر موٹر نے ایک نہ مانی
نتھو نے اس کو پلایا پانی

پھر نتھو نے جیب ٹٹولی
اپنی افیون کی ڈبیا نکالی
اور اک انٹا اس کا چڑھایا
کانی آنکھ کا آنسو پوچھا
پھر جھنجھلا کر ہاتھ بڑھایا
موٹر کو سرپٹ دوڑایا
اب صاحب موٹر جو بھاگی
پیچھے سے آواز یہ آئی
"دوڑو لوگو مجھ کو اٹھاؤ"
"میں مرتا ہوں مجھ کو بچاؤ"
یہ آواز تو خالو کی تھی
اور ہم سمجھے بھالو کی تھی
پھر بابا بھی یہ چلائے،
"دیکھو موٹر آگے نہ جائے"
چچا نے موٹر رکوائی،
اب ہم سمجھے بات یہ کیا تھی
خالو ایک طرف الٹے تھے،
بابا کپڑے جھاڑ رہے تھے
چچا نے خالو کو اٹھایا،
امی نے بابا کو سہلایا

لڈو بچارے بکھرے پڑے تھے
ان کو بچانے کو ہم لپکے
کچھ تو ہم نے منہ میں رکھے
اور کچھ جیبوں میں بھر ڈالے
لو دیکھو مجو بھی آیا
شبدو اس کے پیچھے لپکا
ٹنو میاں بھی آ جائیں گے
پھر وہ بھی منہ گرمائیں گے
ہم نے یہ سوچا کھسکو بھائی
ورنہ پھر شامت ہی آئی

رباعیات

O

اسلوبِ بیان آبِ رواں سے آیا
لفظوں میں اثر برقِ تپاں سے آیا
روشن ہے جو تن جہانِ معنی کی طرح
تو دردِ دل افروز کہاں سے آیا

O

اے محشرِ زیست سے گزرنے والو
رو رو کے سحر کو شام کرنے والو
مہنگی ہے موت زندگی کے بدلے
اے حشر سے لَو لگا کے مرنے والو

O

باقرؔ تجھے راہِ دل میں کس نے لوٹا
دامانِ خیالِ یار کیسے چھوٹا
دے ڈھیل کہ آس کا ہے رشتہ نازک
کھینچا تو جانِ من یہ دھاگا ٹوٹا

O

جی جان سے دل لگایا بھی گیا
جی بھر کے کوئی فریب کھایا بھی گیا
دن کے دن تھا وہ مہر سایہ افگن
رات آئی تو شہرِ دل سے سایہ بھی گیا

O

بند آنکھ کرو ذہن کی کھڑکی کھولو
تنہائی میں جب غضب ہے، دِل سے بولو
دیوار سے ٹکٹکی لگانے والو
خود اپنے ہی سائے سے لپٹ کر رو لو

O

کیوں شکوہ سرائیاں ہیں آشفتہؔ دماغ
دنیا میں کسے ہے دولتِ غم سے فراغ
دیکھ آنکھ اٹھا کے ماہ و انجم کے ہجوم
ضو دیتے ہیں آسماں کے سینے کے یہ داغ

◆◆◆

[illegible] باقر نقوی ایک شخص نہیں ایک عہد کا نام ہے جس میں [illegible]

[illegible] کے ان [illegible]

[illegible] شعر و ادب [illegible]

[illegible] باقر صاحب کے [illegible]

[illegible] باقر صاحب اپنی زندگی کے [illegible]

[illegible] کرتے ہیں۔

[illegible] باقر صاحب [illegible] احوال [illegible]

ان کی شاعری [illegible] ان کی [illegible]

[illegible] باقر صاحب

[illegible] سے ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] ہیں۔

[illegible] باقر صاحب کی [illegible]

[illegible] گئیں۔ [illegible] ان کے [illegible]

[illegible] باقر صاحب [illegible]

[illegible] ہے جس میں باقر

صاحب کی [illegible] شاعری اور ان کی [illegible]

[illegible] ہیں۔ جس کے [illegible]

باقر صاحب کی شاعری [illegible]

[illegible]

[illegible] باقر

صاحب کے [illegible] ان کے [illegible]

[illegible]

کرتا ہوں۔

[illegible]



ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

- اصل نام: سید اولادِ باقر
- مستقل نام: سجاد باقر رضوی (۱۹۴۲ء سے)
- عرفیت: تیر
- والد کا نام: سید علی سجاد
- والدہ کا نام: راضیہ بی بی
- تاریخ ولادت: ۴؍اکتوبر ۱۹۲۸ء
- مقام ولادت: چھانواں، تحصیل پھول پور، ضلع اعظم گڑھ
- تعلیم:

جماعت دوم سے چہارم تک
(میونسپل اسکول دارو شاہ و تاج الدین، محلہ شاہ گنج)
جماعت ہفتم، ہشتم
(ونگو ورینکلر مڈل اسکول، بعد میں الہ آباد ہائی اسکول نام ہو گیا)
میٹرک، پرائیویٹ، یوپی بورڈ، بھارت، ۱۹۳۲ء
انٹرمیڈیٹ، پرائیویٹ، یوپی بورڈ، بھارت، ۱۹۳۶ء
ایل ایل بی، سندھ مسلم لا کالج، کراچی، ۱۹۵۱ء
بی اے آنرز، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۵۳ء
ایم۔اے انگریزی، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۵۶ء
(یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی)
ایم۔اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۶ء
پی ایچ۔ڈی، اُردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۵ء
عنوان مقالہ: طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی شاعری میں طنز و مزاح

- شادی: ۶؍اپریل ۱۹۶۶ء
- اہلیہ کا نام: قیصر جہاں (پ ۱۹۳۸ء)
- صاحبزادگان:

۱۔ سید حسن سجاد رضوی (پ ۱۹۷۰ء)
۲۔ سید حسین سجاد رضوی (پ ۱۹۷۲ء)

- ملازمت:

(۱) لیکچرار انگریزی، اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور، ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۳ء (۲) لیکچرار انگریزی (بی۔اے آنرز و اُردو)، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۰ء (۳) اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۶ء (۴) ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۸ء (۵) پروفیسر اُردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۸۸ء

- ملازمت سے سبکدوشی: ۴؍اکتوبر ۱۹۸۸ء
- وفات: ۱۳؍اگست ۱۹۹۳ء
- مدفن: قبرستان ماڈل ٹاؤن، جی بلاک، لاہور
- تصانیف:

(۱) تہذیب و تخلیق (تنقید) طبع اول ۱۹۶۶ء، طبع دوم ۱۹۸۷ء (۲) مغرب کے تنقیدی اصول، (تنقید) طبع اول ۱۹۶۶ء، طبع دوم ۱۹۷۱ء، ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۸۵ء، طبع سوم ۱۹۸۷ء، طبع چہارم ۱۹۹۳ء (۳) تیشۂ لفظ (شاعری) طبع اول ۱۹۶۸ء، طبع دوم ۱۹۹۱ء، (۴) داستانِ مغلیہ (انتخاب و ترجمہ) طبع اول، ۱۹۶۸ء، طبع دوم ۱۹۹۷ء، مصنف: نکولائی منوچی۔ ترجمہ انگریزی، ولیم اروِن (۵) جدید ناول نگار امریکا میں (ترجمہ) ۱۹۶۹ء، مصنف: جیک لڈوِگ (۶) افتادگانِ خاک (ترجمہ) ۱۹۶۹ء، مصنف: فرانز فینن (۷) غالب۔ ذاتی تاثرات کے آئینے میں (مرتبہ) ۱۹۶۹ء، (۸) وضاحتیں (تنقید) ۱۹۸۸ء، (۹) معروضات (تنقید) ۱۹۸۸ء، (۱۰) باتیں (تنقید)، ۱۹۸۸ء، (۱۱) بلالؓ (ترجمہ) ۱۹۸۸ء، مصنف: ایچ اے ایل کریگ (۱۲) قائداعظم محمد علی جناح۔ معمارِ پاکستان (تحقیق و تجزیہ) ۱۹۸۸ء، (۱۳) جوئے معانی (شاعری) ۱۹۹۱ء، (۱۴) بدلتی دنیا کے تقاضے (ترجمہ) ۱۹۹۱ء، مصنف: ارنسٹ ایف شوماخر (۱۵) علامہ اقبال اور عرفیِ حال (تنقید) ۱۹۹۳ء، (۱۶) جدید دنیا میں روایتی اسلام (ترجمہ) ۱۹۹۶ء، مصنف: ڈاکٹر سید حسین نصر